

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_188327

UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۹۲۰۸ . Accession No. ۱۳۰۶۲

Author جهان بابو سکیم محمد حسن آرزو ج ۱۳۰۶۲

Title محمد حسن آرزو

This book should be returned on or before the date last marked below.



Checked 1975

ملکوں حسین ازاں

سلسلہ مطبوعات ادارہ ادبیات اردو شمارہ (۵۱)

محمد حسین آزاد

جلد

شمس العلماء مولوی سید محمد حسین آزاد دہلی

(۲)

حالات زندگی اور تصنیفات و کلام پر تبصرہ

آش

جہاں بانو بیگم (فقوی ایم اے)

(۱۹۴۰ء)

ناشر

ادارہ ادبیات اردو قیمت مندرجہ خیریت آباد حیدر آباد دکن

قیمت (عالم)

شعبہ نسلوان ادارہ ادبیات اردو کی دوسری کتابیں

1985

سکینہ بیگم صاحبہ	مرتبہ	(۱) نذر دکن
لطیف النساء بیگم صاحبہ ایم۔ اے	از	(۲) من کی پتیا
رابعہ بیگم صاحبہ	از	(۳) ستیلی ماں
سیکینہ بیگم صاحبہ	مرتبہ	(۴) رسائل طیبہ
لطیف النساء بیگم صاحبہ ایم۔ اے	از	(۵) بچوں کی نظمیں
طالبات جامعہ عثمانیہ	از	(۶) نذر ولی

C

۹۲۸

۷۲۵

محرم الحرام ۱۴۰۲

مطبوعہ

مکتبہ ابراہیم شین پریس چیک آباد۔

فہرست

- (۹) عرض حال
- (۱۳) ۱۔ آزاد کے حالات زندگی (تاریخ ولادت اور خاندان)
- (۱۵) (مولوی محمد باقر کی وجہ شہادت)
- (۱۸) (اولاد)
- (۲۰) (شجرہ نسب)
- (۲۱) (آغا محمد طاہر صاحب)
- (۲۵) (آغا محمد اشرف ایم۔ اے)
- (۳۱) (آزاد کی شکل و شمائل)
- (۳۲) (عادات و خصائل)
- (۳۸) (کھانے کا شوق)
- (۴۰) ۲۔ آزاد کی دہلی کالج میں تعلیم
- (۴۱) (آزاد کی آزادی)
- (۴۲) (دہلی کو خیر باد کہتے ہیں)
- (۴۳) (سفر)

(۴۳)

(ملازمت)

(۴۴)

(شمس العلماء کا خطاب)

(۴۴)

(آزاد کا حافظہ)

(۴۵)

(بیماری)

(۴۵)

(آزاد کی دیوانگی)

(۵۰)

(اصلاح کا واقعہ)

(۵۱)

(السنٹ صاحب کا ذکر)

(۵۲)

(آزاد کو دیوانگی میں دیکھنے والے)

(۵۹)

(وفات)

(۶۱)

۳۔ اساتذہ اور احباب

(۶۲)

(حکیم آغا جان عیش سے تکمیل ادب)

(۶۳)

(حکیم آغا جان عیش)

(۶۳)

(احباب)

(۶۵)

(میسر سید حسن (بلگرامی)

(۶۵)

(حکیم محمد دین صاحب)

(۶۵)

(مولانا سید ممتاز علی صاحب مرحوم)

(۶۶)

(ڈاکٹر لائٹنر)

- (۶۶) (شاگردوں سے تعلقات)
- (۶۷) (حکیم نامہ نظیر فراق دہلوی)
- (۶۸) م۔ آزاد کی تصانیف
- (۷۲) (آبِ حیات)
- (۸۰) (نیزنگ خیال)
- (۸۹) (نیزنگ خیال حصہ دوم)
- (۹۴) (دربار اکبری)
- (۱۰۸) (سیر ایران)
- (۱۱۵۱) (سخندان فارس)
- (۱۲۵) (نگارستان فارس)
- (۱۳۰) (مکتوبات آزاد)
- (۱۴۴) (فلسفہ الہیات)
- (۱۴۸) (سالہ سبک دہانک)
- (۱۴۹) (دیوان ذوق)
- (۱۵۰) (نظم آزاد)
- (۱۵۰) نصیحت کا کرن بھول
- (۱۵۰) (اخبارات الملت پنجاب اور پنجاب میگزین)

۵۔ آزاد کی شاعری

(۱۵۲)

(تصنیف کے آزاد)

(۱۶۰)

(تصویر کے آزاد)

(۱۶۳)

۶۔ آزاد کی پیرایہ تنقید

(۱۷۸)

۷۔ آزاد کا درجہ اردو ادب میں

(۱۹۴)

سوانح آزاد کے ماخذ

دیباچہ عمومی

شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد اردو کے اُن مخصوص محسنوں میں سے ہیں جن کا نام اور خدمات تاریخ ادب اردو کا جزو لاینفک ہیں لیکن یہ ہماری زبان کی بد قسمتی ہے کہ اس کے بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کے متعلق اب تک جیسا چاہیے کوئی کام نہیں کیا گیا۔ نہ ان کے سوانح حیات شائع ہوئے اور نہ ہی ان کے کارناموں کا تجزیہ کر کے ان کی حقیقی عظمتوں اور حثیتوں کو اجاگر کیا گیا۔

یہ ہمارا سب سے پہلا فریضہ ہے کہ نام نیک رنگاں کو ضایع نہ ہونے دیں ان کی حیات اور کارناموں کے مطالعہ سے مستفید ہوتے رہیں اور اپنے مستقبل کے بنانے میں ان سے سبق حاصل کریں۔ آزاد کی اہمیت اردو ادب میں مسلم ہے لیکن کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ آج تک کسی نے ان کے سوانح حیات کے مرتب کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ ابھی حال میں ایک کتاب ”آب حیات کے لطیفے“ شائع ہوئی ہے جس کے دیباچہ میں آزاد کے کچھ حالاتِ زندگی بھی آگئے ہیں لیکن مستقل سوانح حیات کی ضرورت باقی تھی جس کو ادارہ ادبیات اردو کے شعبہ نسوان کی سرگرم رکن محترمہ جہاں با نو بیگم صاحبہ ایم اے نے نہایت

خوش سلیقگی اور کامیابی کے ساتھ تکمیل کو پہنچایا ہے۔ جہاں بانو بیگم صاحبہ اصل میں دہی ”ج۔ نقوی“ ہیں جو حیدرآباد کی مشہور ادیبہ اور کئی مفید و دلچسپ کتابوں کی مصنفہ ہیں۔ ”رفقا خیال“ ان کے رشحاتِ قلم کا پہلا مجموعہ ہے جو کتابی صورت میں شائع ہو کر کافی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے کئی اور مضامین اور کتابیں بھی لکھی ہیں اور ان کا شگفتہ اسلوب بیان بہت مقبول ہے۔ زیر نظر کتاب اصل میں ان کے امتحان ایم اے کا مقالہ ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ مؤلفہ کی نظر کتنی وسیع ہے اور وہ تحقیقی کام بھی کس خوبی سے انجام دیتی ہیں۔

ادارہ کے شعبہ نسوان کی طرف سے اس سے قبل ’نذر دکن‘ (مرتبہ محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ معتمدہ شعبہ نسوان) ’نذر ولی‘، ’من کی بتیا‘ (از لطیف النساء بیگم صاحبہ ایم اے) اور سوتیلی ماں (از محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ صدر شعبہ نسوان) جیسی مفید کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور اب اس سوانحِ آزاد کی اشاعت سے اس کی مطبوعات میں اور ایک اور معیاری کتاب کا اضافہ ہو رہا ہے، توقع ہے کہ یہ شعبہ صنفِ نازک میں علمی و ادبی بیداری پیدا کرنے میں پوری طرح کامیاب ہوگا اور یہ خود کوئی کم فخر کی بات نہیں ہے کہ اس کی طرف سے قلیل عرصے میں پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

سید محی الدین قادری زور
معتمد اعزازی

یکم جنوری ۱۳۵۶ء

عرضِ حال

کارلائیل کہتا ہے ”تاریخِ عالم صرف اس کے بڑے بڑے اشخاص کی تاریخ کا نام ہے“ مگر ہمارے ملک میں بڑے بڑے آدمی بھی گوشہ نشین ہیں بستے ہیں۔ آزاد جیسے شخص کی تاریخِ حیات آج تک کسی نے لکھنے کی زحمت گوارہ نہ کی۔ ع

کہ آبِ چشمہٴ حیواں درونِ تاریکی است

اتنا بڑا آدمی، ایسا زبردست ادیب و انشا پرداز اور یوں عالم کس میسر میں پڑا رہے۔ نذیر احمد اور حالی مرعوم کی سوانحِ عمریاں لکھی گئیں مفصل نہ سہی مختصر و تشنہ ہی۔ مگر لکھا تو گیا ہے۔ آزاد کے معاملے میں سب ساکت و صامت بیٹھے ہیں۔ اور یہی سمجھ لیا ہے کہ اُنھ ”کیجیے یاد نہ بھولے ہوئے افسانے کو“

آزاد کو انتقال یکے ۲۹ برس ہو گئے۔ مگر جیسی چیز ان کی زندگی کے متعلق تیار ہونی چاہیے تھی وہ اب تک نہ ہو سکی۔ تذکروں میں اور شعرا و مصنفین کی طرح آزاد کا ذکر بھی ضمناً و تذکرۃً کیا گیا ہے مثلاً سب سے

پہلے مولف خزانہ جاوید نے ان کا ذکر کیا۔ اور ابتداء اس طرح سے کی ہے
 ”آزاد جھنوں نے تذکرہ آبِ حیات لکھ کر اپنے نام کو زندہ جاوید بنا دیا۔“
 اور پھر اُن کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا کچھ یوں ہی سا ذکر کر دیا ہے۔ نمونہ بھی
 ان کے کلام کا دیا ہے۔ آبِ حیات کو جو ان کا ادبی شہکار ہے نظر انداز کر دیا،
 پھر سیرِ الصنفین نے لکھا۔ ان کے یہاں آزاد کی دیوانگی کا حال ذرا
 تفصیل سے ہے۔ آبِ حیات کی خوب جی کھول کر تعریف اور پھر کچھ مذمت بھی
 کی ہے۔ وہی غلط بیانیوں کا الزام موجود ہے۔ جو بد نصیب آزاد کے دامن کا
 ایک ایسا مٹا دھبہ بن گیا ہے۔ گویا آزاد نے جو کچھ بھی لکھا سب من گھڑت
 قصے ہیں۔ کاش جبرئیل علیہ السلام ہی ان کے تابع ہو جاتے اور لکھتے وقت
 کہتے جاتے کہ یوں نہیں یوں لکھو۔

مصنف گلِ رعنا تو خون لگا کر شہیدوں میں داخل ہوئے ہیں۔ ایک
 دو مضمون میں قصہ ہی ختم کر دیا ہے۔ زیادہ حصہ ان کے صفحات کا اقتباس
 کی بھرتی سے معمور ہے۔ نہ ان کی ادبی خدمات کا ذکر ہے نہ تعلیمی سرگرمیوں کا
 بیان ہے۔ نہ زندگی کے حالات ہی بتائے ہیں۔ کچھ کتابوں کا ذکر بریلِ تذکرہ
 بہت ہی مختصر پیرایے میں کر دیا ہے۔ تاریخِ پیدائش سرے سے ندارد ہے۔
 وفات کا سنہ جو لکھا ہے وہ غلط۔

پھر سکسینہ ہیں۔ یہ نچوڑ ٹھہرا سارے تذکروں کا۔ اب کس سے محرومی
قسمت کی شکایت کیجئے۔ انھوں نے کچھ یہاں سے لیا کچھ وہاں سے کچھ ادھر سے کچھ ادھر
اور یوں ج

لائے ہیں باغ سے اوروں کے لگا کر ڈالی

اب رہے ڈاکٹر گزہم بلی۔ ان کا تذکرہ تو اس کا عکس ہے۔ وہ نہ لکھیں بھی تو
شکایت کب ہو سکتی تھی۔

سروری صاحب کی جدید اردو شاعری البتہ آزاد کو ایک گونہ تاریخی
اہمیت دیتی ہے تاہم وہ بھی تشنہ ہے۔

کیفیتی دہلوی نے منشورات میں آزاد پر ایک بحث کی ہے۔ انھوں نے
بھی اور تذکروں کی مدد سے اپنی حتی الوسع بڑی کدو کاوش سے ان پر قلم
اٹھایا ہے۔ سروری صاحب کی طرح آزاد مرحوم کی ادبی خدمات کا سچے
دل سے اعتراف کرتے ہیں۔ وہ آزاد کو فارسی کا ایک عالم متبحر اور عربی کا
بہت بڑا عالم مانتے ہیں۔ اس طرح انھوں نے کوئی تذکرہ نہیں لکھا لیکن
وہ معترف ہیں کہ مشاہیر عالم کی صف میں آزاد کا کیا درجہ ہے۔ اور ان پر
۲۰-۲۲ صفحات کا مضمون لکھا ہے۔

اکثر نقادوں اور سوانح نگاروں نے ان کی اکثر کتابوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔

ان کی کتاب پر کتاب برآمد ہوتی جاتی ہے جس سے اندازہ لگتا ہے کہ آئندہ بھی ان کی کچھ کتابیں ضرور شائع ہوں گی۔

ہم نے اپنی اس کتاب میں حسب ذیل عنوانات پر اس تمام مواد کو فراہم کیا ہے جو بالعموم اور تذکرہ نویسوں نے چھوڑ دیا تھا :-

(۱) خاندانی حالات جس میں حسب نسب، مولوی باقر مرحوم کی شہادت کا واقعہ اولاد۔ اُن کا خاندانی شجرہ۔

(۲) عادات و خصائل - (۳) خوراک و لباس -

(۴) دیوانگی کے حالات - ان کو اس عالم میں کس کس نے دیکھا۔

(۵) ان کی موت کے سلسلے میں ان کی قبر کی تصویر بھی چسپاں کی ہے۔

(۶) آزاد کی مندرجہ ذیل مشہور کتابوں پر نہایت دلچسپی کے ساتھ نظر ڈالی ہے۔

آبِ حیات سننِ فارس سپاک و نمناک

دربارِ اکبری نگارستانِ فارس سیرِ ایران

نیرنگ خیال (حصہ اول و دوم) فلسفۃ الہیات مکتوباتِ آزاد

آزاد کے تنقیدی پیرایہ پر ایک طویل مضمون دیا ہے۔

سب سے آخر

آزاد کا درجہ اُردو ادب میں کیا ہے

اس کو نہایت تفصیل سے بتایا ہے

جہانِ بانو گم

آزاد کے حالاتِ زندگی

تایخ ولادت اور خاندان | اردو کے اس مایہ ناز ادیب کی ولادت ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۵۵ھ مطابق ۱۳ ستمبر ۱۸۳۸ء کو

دہلی میں ہوئی۔ ان کی تایخ پیدائش ”ظہور اقبال“ سے نکلتی ہے۔

مولوی محمد حسین آزاد کے آباؤ اجداد شاہ عالم کے زمانے میں ہمدان (ایران) سے براہ کشمیر ہندوستان آئے۔ اور خاک ہند اسی دامن گیر ہوئی کہ یہیں کے ہو رہے۔ آباؤ اجداد کا پیشہ اجتہاد تھا۔ چنانچہ یکے بعد دیگرے بہت سے مجتہد اس خاندان میں پیدا ہوئے۔

آزاد مولوی محمد باقر مرحوم کے خلف الرشید تھے۔ جو خاقانی ہند

شیخ ابراہیم ذوق کے دلی دوست تھے۔ شمالی ہندوستان میں سب سے پہلا اردو اخبار نکالنے کا سہرا انھیں کے سر ہے۔ یہ اخبار ۱۳۶۶ھ میں انھوں نے نکالا۔

اس واقعہ کا ذکر مولانا آزاد نے آبِ حیات کے صفحہ ۲۶ پر کیا ہے

اس کا نام ”اردو اخبار“ منہتہ وار تھا۔ اس کی اب کوئی کاپی نہیں ملتی۔

کیونکہ یہ غدر میں ضبط ہو گیا تھا۔ مولوی محمد باقر پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ

انھوں نے دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر ٹیلر کو بجائے اپنے ہاں پناہ دینے کے باغیوں کے حوالے کر دیا۔ بالآخر اسی الزام پر ان کو شہید کر دیا گیا۔

مولوی محمد باقر صاحب شیعوں کے بہت بلند پایہ مجتہد تھے۔ جو اس وقت

کشمیری دروازہ چھوٹے بازار میں رہتے تھے۔ ان کا قدیم مکان اب بھی موجود ہے۔ اور ان کے اعزاء و اقربا اس مکان میں رہتے ہیں ان کے کئی مکان قریب قریب تھے۔ ان میں سے ایک اخبار کا دفتر اور چھاپہ خانہ تھا۔ دوسرا خود ان کی سکونت کا مکان تھا۔ اور قیسرا امام باڑہ۔ جس کی تاریخ ذوق نے کہی تھی۔

تعزیت گاہِ امام دارین

اس بستی کے قریب باقر صاحب نے ایک مسجد بھی تعمیر کرائی تھی جو اب تک

موجود اور ”کھجور والی مسجد“ کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں مولوی صاحب

نماز پڑھتے تھے۔ اور وعظ بھی کیا کرتے تھے۔ مولوی صاحب کا ہندوستان میں

اُردو کا پہلا چھاپہ خانہ تھا۔ اور اس میں عموماً مذہبی کتابیں چھپا کرتی تھیں۔

اس واقعہ کا حوالہ مرزا غالب نے اپنے خطوط میں درج کیا ہے۔ ان کا ذاتی

کتب خانہ بھی غدر کی نذر ہو گیا۔ ان کا خاندانی مذہب امامیہ تھا۔

آزاد خلوں کے معزز خاندان کی ایک بے مثل یادگار تھی۔ ان کی والدہ

ایرانی النسل تھیں۔

مولوی محمد باقر کی وجہ شہادت | یوں تو مولوی محمد باقر مسٹر ہڈن کے نزدیک کئی جرائم کے مرتکب تھے مثلاً (۱) ۱۹۵۵ء میں مولوی صاحب نے سیاہ رنگ کا پہلا اُردو اخبار دہلی سے جاری کیا تھا۔ جس کے مدیر وہ خود تھے اور جس میں بقول ان کے انگریزوں کے خلاف بہت سخت مضامین لکھے جاتے تھے۔ اور بہادر شاہ ظفر کی تعریف چھپا کرتی تھی۔

(۱) یہ کہ وہ ٹیلر صاحب کے قاتل تھے۔

(۲) ٹیلر صاحب کی تحریر بھی نہ تھی۔ دستخط بھوٹے تھے۔ دستخط کا قصہ یہ کہ

ٹیلر صاحب جو نسلاً انگریز تھے اور غدر سے پہلے دہلی کالج میں پروفیسر رہ چکے تھے۔ انھوں نے باقر صاحب سے اُردو اور فارسی بھی پڑھی تھی۔ غدر کی فتنہ خیزیوں سے پناہ لینے وہ مولوی صاحب کے گھر گھس آئے۔ اُن کے گھر سے زیادہ کوئی محفوظ جگہ ان کے لیے ربع مسکون میں نہ تھی۔ وقت بہت نازک تھا ہندو مسلمان دونوں انگریزوں کے خون کے پیاسے بنے ہوئے تھے۔ مولوی صاحب نے ٹیلر صاحب کو اپنے گھر رکھ تو لیا تھا۔ مگر ہر آن ان کی موت کا کھٹکا لگا ہوا تھا آخر زندگی کا ساغر لبریز ہو گیا وقت نے غمازی کی یا حملہ والوں کی سرگوشیوں سے بھنک پڑی۔ باغیوں کو مار غلگ ہی گیا۔ آزاد کے مکان کا سب نے محاصرہ

کر لیا۔ دھکیاں دینی شروع کیں کہ ٹیلر صاحب کو حوالہ کر دو ورنہ ہم گھر بار کو آگ لگا دیں گے۔ مولوی صاحب کو گھر کا برباد ہو جانا منظور تھا مگر اپنے جہان کو حوالہ کر دینا گورانہ تھا جب مسٹر ٹیلر نے جوش عقیدت اور اظہار خلوص کا یہ رنگ دیکھا کہ ان کی خاطر مولوی صاحب کے گھر پر آنچ آگئی تو ان کی شرافت نفس اور پاکیزگی ضمیر کو جوش ہوا اپنے استاد سے ضد اور اصرار کر کے باہر نکل آئے۔ ان سے پہلے اظہار تشکر میں ایک لاکھ پچھتر ہزار کے نوٹ مولوی صاحب کی نذر کیے۔ پھر دنیا کی بے اعتباری اور غداری کا جو خیال آیا تو اپنے دستخط بھی کر دیے۔ اور یہ صاف صاف لکھ دیا کہ یہ رقم میں نے بطیب خاطر مولوی صاحب کی نذر کی ہے۔ یہ سب کچھ ہوا۔ مسٹر ٹیلر جوں ہی باہر نکلے۔ قضا کے ہر کاروں نے باغیوں کے بھیس میں ان کا خیر مقدم کیا۔ اور آپے سے باہر ہو کر اس بے گناہ کو قتل کر ڈالا۔

جب غدر کی آگ فرو ہو گئی تو مولوی صاحب نے اپنی انتہائی شرافت وضع داری۔ صدق گوئی اور ایشیا نفس کا ثبوت اس طرح دیا کہ وہ تحریر جس پر ان کے دستخط تھے اور تمام نوٹ ہڈن صاحب کے ہاں لے گئے۔ ابھی ان کی زبان سے تمام واقعات سننے بھی نہ پائے تھے کہ دفعتاً انھوں نے سوال کیا ”مسٹر ٹیلر کہاں ہیں“ اس کا جواب صاف سیدھا اور سچا ملنے پر

مسٹر ٹنسن کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اُنھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً حکم دیا ”گولی مارو“ حکم کی دیر تھی کہ آناً فاناً میں محمد باقر کی لاش خاک و خول میں فرش زمین پر تر پنے لگی۔ اس روح فرسا حادثہ کے بعد ان کے گھر بار کو ضبط کرنے کا حکم جاری ہوا۔ ان کی منقولہ و غیر منقولہ جائیداد ضبط کر لی گئی۔ اُردو اخبار کا ایک ایک پرچہ ضبط کر کے سخت سلطنت جلوا دیا گیا۔

آزاد نے باپ کو شہید ہوتے گھر بار کا خاتمہ ہوتے دیکھا تو ان کے ہوش پڑاں تھے۔ اپنے ایک جان نثار ملازم کے ساتھ اپنے اہل و عیال کو سوئی پت بھجوا دیا۔ صرف استاد ذوق کا کلام جو کچھ بھی غدر کی دسنبند سے بچ گیا تھا نفل میں مارا اور چل کھڑے ہوئے۔ حیدر آباد دکن، لکھنؤ اور خدا جانے کہاں کہاں مارے مارے پھرے۔

ذیل میں ہم آزاد کے اعزاء و اقربا پر ایک نوٹ لکھتے ہیں جو بظاہر کسی طولانی ہے لیکن ان میں سے ہر شخص کا تعلق آزاد سے ہے جی نہیں چاہتا کہ آزاد کی اولاد صوری کا ذکر نہ لکھا جائے۔

شکسپیر کے رشتہ کا ایک شخص پانچ سال ہوئے فوت ہو گیا۔ لندن کے اخباروں نے اس کی تصویر دی۔ ۳۱، ۳۲ سال بعد مقابلہ کرنے سے شکسپیر کی تصویر اس سے ملتی جلتی تھی۔ اس سے پتہ چلا لیا کہ یہ شکسپیر کا

کوئی عزیز ہے۔

ڈکنس کو مرے ہوئے ۵۰ سال گزرے لیکن ایک مہرچی جو ڈکنس کا جوتا بناتا تھا بہت بڑی عمر کو پہنچ کر جب حال میں مرا تو انگلستان کے اخباروں میں اس کا اور اس کے حالات کا ذکر آیا محض اس بنا پر کہ اس کا لگاؤ ڈکنس سے تھا۔ سودا اور میر کی ذریات میں کسی کا نشان تک باقی نہیں اس کی وجہ یہ لوگوں نے ان فرماں روایان سخن کے حالات کو تفصیل کے ساتھ قلم بند نہیں کیا۔ جتنا ان کو یاد رکھا اتنا ہی ان کے خاندان کو فراموش کیا۔

اولاد | آزاد مرحوم کے ہاں ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئی لڑکے کا نام محمد ابراہیم تھا یہ غالباً ذوق سے انتہائی محبت کا نتیجہ تھا کہ بیٹے کا نام انھوں نے ابراہیم رکھا۔ انھیں یہ پیار سے ابرو کہا کرتے تھے۔ ان کے خطوط میں ان کا ذکر اس لادنے نام سے آیا ہے۔ محمد ابراہیم پنجاب ہی میں منصفی کے عہد پر مامور تھے۔ باپ کے ۱۲ سال بعد ۱۹۲۷ء میں انتقال کیا۔ کثیر الاولاد تھے۔ آزاد کو

لے۔ آغا محمد طاہر فلسفۃ الہیات کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ آزاد مرحوم کے ہاں ۱۷، ۱۸ بچے پیدا ہوئے۔ اکثر بڑے۔ جوان ہوئے۔ پروان چڑھے مگر قریب قریب سب آنکھوں کے سامنے خاک کا پیوند ہو گئے۔

ان کے بچوں سے انتہا درجہ محبت تھی بچے باپ سے بالعموم علیحدہ رہتے تھے۔ کیونکہ اکثر ملازمت کے سلسلے میں انھیں باہر ہی رہنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ اگرچہ دیوانگی نے آزاد مرحوم کے خیالات و جذبات کو تہ و بالا کر رکھا تھا اور وہ کسی کام کے نہ رہے تھے۔ لیکن ان بچوں سے آزاد کو محبت تھی وہ دیوانگی کے عالم میں بھی ان کے دل میں سر نہ ہوئی۔ جس طرح ہوش و حواس کے زمانہ میں ان سے پیار کی باتیں کرتے اور ان کے ساتھ کھیلنے تھے اسی طرح ان کا وہی برتاؤ جنون میں بھی جاری رہا۔ لیکن اور لوگوں سے جو ہوش و حواس میں خلوص تھا وہ اب باقی نہ رہا تھا۔ فقداں محبت کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان کے محبوب دوست اگر کوئی بات ان کی طبیعت کے خلاف کرتے تو وہ اس کی تاب نہ لاتے۔ بگڑ بیٹھتے۔ اور ایسی حرکات کرتے جن سے ان کو رنج ہوتا۔

اپنی اکلوتی لڑکی سے آزاد مرحوم کو گویا عشق تھا۔ انھوں نے اس کو بڑے شوق سے عربی، فارسی کی تعلیم دی تھی۔ وہ نوشت و خواند میں ان کا دست و بازو تھیں۔ ان کی کتابوں کے سارے مسودے وہی نقل کرتیں۔ ایک روایت کے بموجب آغا محمد اشرف لکھتے ہیں کہ ”نصیحت کا کرن پھول“ انھیں کی تصنیف ہے۔ ان کی شادی ریاست پٹیالہ کے خلیفہ نام ایک مشہور و معزز خاندان میں ہوئی تھی۔ ان کے شوم خلیفہ محمد کاظم وہاں کے سشن جج تھے۔ اور ان کے بھائی

خلیفہ سید محمد حسین ریاست کے وزیر اعظم تھے۔ آزاد کی اس ہونہار اکلوتی لڑکی کا انتقال عین عالم شباب میں ہو گیا۔ جس کا انھیں بے حد صدمہ ہوا۔ اسی غم و الم کی شدت میں ان پر جنون کے آثار ظاہر ہوئے۔

سیر ایران میں صفحہ ۶۰ پر لکھا ہے ”میری اس بیٹی کی موت جو مجھے سات بیٹیوں سے گراں تھی میری تصنیفات میں میرا دہنا ہاتھ تھی۔ اس کے مرنے سے میرا دل ٹوٹ گیا اور تصنیفات کا قلمدان الٹ گیا یہاں تک کہ اکثر ہوشمندوں کو جنون کا شبہ ہو گیا۔

شجرہ نسب | آغا محمد اشرف صاحب نے آزاد مرحوم کا جو شجرہ نسب روانہ فرمایا ہے وہ بحسنہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

مولوی محمد باقر (اُردو اخبار ۱۳۳۳ھ)

مولوی محمد حسین آزاد

آغا محمد ابراہیم مصنف مرحوم
امت السکینہ
مرصیہ نگار مرحوم
آغا محمد اسماعیل مرحوم
آغا محمد یوسف مرحوم
آغا محمد طاہر
آغا محمد باقر ایم۔ اے
خاکسار (آغا محمد اشرف)

”ان کے علاوہ تین کہنیں ہیں، جو قلت گنجائش کی وجہ سے اوپر نہیں لکھ سکا۔
یہ تینوں زندہ ہیں۔ میرے سب سے بڑے بھائی آغا طاہر مولانا آزاد کی کتابوں کا
کاروبار کرتے ہیں۔ آغا محمد باقر دہلی کے ایک کالج میں استاد ہیں۔ اور خاکسار کا
حال آپ جانتی ہی ہیں۔ میری ایک بہن ایران میں مقیم ہیں۔ ان کے شوہر
ہندوستانی ہیں۔ لیکن ایک عرصہ سے ایران میں تیل کمپنی میں ملازم ہیں۔ اس
سلسلے میں ان کا قیام وہاں ہے۔ اگرچہ وہ ہندوستان اکثر آتی رہتی ہیں۔“
آغا محمد طاہر صاحب | یہ محمد ابراہیم صاحب کے خلف اکبر ہیں اور آزاد
بک ڈپو کے مالک و منتظم۔ مجھے صاحب موصوف سے مولانا آزاد کے متعلق کچھ
معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ آپ نے امید تو بہت بندھائی تھی اور میرے استفسار
پر لکھا بھی تھا کہ ”آپ کے مطلوبہ مضامین کی نسبت میں ہر قسم کی خدمت کو حاضر
ہوں۔ مگر دریا کوزہ میں کیسے بند کر کے بھیج دوں۔ لکھنے کو تو بہت مختصر سی بات
ہے کہ حضرت آزاد کے حالات لکھ دیجیے۔ مگر حقیقتاً یہ مضمون شاید ایک دفتر میں
بھی نہ آ سکے۔ چند عنوان قائم کر کے مجھے لکھ بھیجیے۔ اس پر میں ۸، ۱۰ صفحوں لکھ کر
پیش خدمت کر دوں گا۔“ میں نے حسب تجویز چند عنوان بھیجے۔ لیکن انھوں نے
خلاف توقع اب تک کوئی جواب نہ دیا۔

مولانا حسن نظامی صاحب دیباچہ مکتوبات، آزاد میں لکھتے ہیں ”ایک دن

میں اپنے رین بسیرے میں بیٹھا تھا۔ گرمی کی شدت۔ دھوپ کی تیزی۔ اوسان کی گھبراہٹ کہ ایک نو عمر صاحبزادے سائیکل لیے ہوئے سامنے آئے۔ گورا چہرہ۔ درمیانہ قد۔ موٹر آنکھیں۔ پیشانی پر پسینہ کے قطروں کی قطار۔ تمازت آفتاب سے لال لال رخسار۔ لکنت آلود زبان میں کہا، حسن نظامی سے ملنا ہے حسن نظامی نے کہا آپ اس سے مل لیے۔ تشریف رکھیے۔ نام بتائیے۔ کام فرمائیے۔ بولے طاہر کہتے ہیں۔ آزاد دہلوی کا پوتا ہوں۔ اردو نثر لکھنے کا شوق ہے۔ اس لیے آیا ہوں کہ لکھنے کا ڈھنگ آجائے۔

سُبحان اللہ! جناب آپ تو سراپا اردو ہیں۔ خدا نے صورت بھی پر مضمون کی طرح دی اور اس کے اندر خون بھی اردو کے استاد کا بھرا۔ آپ کو کسی کے بتانے اور سکھانے کی کیا ضرورت، آیا کیجیے یہ آپ کا گھر ہے۔ ایک برس کے بعد اضی طاہر کے برابر لاہور شہر میں ایک مکان کے اندر کھڑا تھا، اور اور وہ کہہ رہے تھے دادا جان یہاں سوتے تھے۔ یہاں کھاتے تھے۔ یہاں لکھتے تھے۔ یہاں ہم بچے ان کے سامنے کھیلتے تھے۔ اللہ اکبر! یہ اس شہرہ آفاق شخص کا گھر ہے جو ہندوستان کا بہت بڑا مصنف اور انشا پرداز تھا۔ ایک حالت آتی تھی ایک حالت جاتی تھی کہ یہ گھریورپ میں ہوتا تو لاکھوں آدمی زیارت کو آیا کرتے۔ ہندوستان قبروں کی زیارت کرتا ہے۔ ان چیزوں کی قدر اس کو

نہیں آتی ” بہر کیف اس زمانہ میں آغا محمد طاہر صاحب نے اپنے جد علی وقار کے سرمایہ ادب کو بڑی آب و تاب سے شائع کرنے میں اپنی بساط بھر سہی فرمائی ہے۔ اور بڑی حد تک ان کے نام کو چمکا دیا ہے۔

مولوی رضا اللہ صاحب فرزند منشی ذکاء اللہ مرحوم کو چہ جیلان دہلی سے میرے دریافت کرنے پر ارقام فرماتے ہیں ” مولانا آزاد مرحوم کے پوتے ہمارے گھر کے بہت ہی قریب رہتے ہیں۔ ان کا اسم گرامی آغا محمد طاہر ہے اور وہ آج کل ”آزاد منزل“ سولن میں مقیم ہیں۔ وہ آپ کے لیے بہت کچھ معلومات فراہم کر سکتے ہیں۔ میں نے ان کے ماموں صاحب سے جو ہمارے عنایت فرما ہیں اور ہمسایہ ہی میں رہتے ہیں دریافت کیا تھا تو ان کی دلپی اکٹوبر کے اوائل میں بتائی تھی۔ وہ آجائیں اور میں یہاں رہوں لکھنؤ یا کئی اور جگہ نہ جاؤں تو میں خود ان سے ساری معلومات حاصل کر کے بھیج دوں گا مگر ان کی طرف سے بھی مایوسی ہی رہی۔ مگر شاید انھیں کے ایماء سے مولوی فرحت اللہ صاحب نے جو منشی ذکاء اللہ مرحوم کے دوسرے صاحبزادے ہیں آزاد مرحوم کے متعلق ایک دلچسپ نوٹ دیا ہے۔ جس کا زیادہ تر حصہ ان کی دیوانگی کے حالات میں درج ہے۔

ڈاکٹر سید سجاد صاحب نے فرمایا ہے کہ آغا محمد طاہر صاحب ۱۹۲۷ء

یہ ۱۹۲۷ء میں آزاد مرحوم کی تصانیف کے قلمی نسخے خود ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مسودے اور ذوق کے قلم کی اصلاحیں برائے فروخت حیدرآباد لائے تھے۔

تحریر سر اکبر کے پاس پیش کی گئی۔ ان کا ارشاد ہوا ان نایاب چیزوں کی یونیورسٹی کلب میں نمائش کی جائے۔ طاہر صاحب نمائش کے نام سے گھبرائے۔ کچھ تو ارباب حل و عقد نے ان پر کوئی توجہ نہ کی اور پھر خدا جانے ان کے دل میں کیا سمائی کہ مسودوں کے بستے باندھ کر دلی کی راہ لی۔

یوں تو آغا صاحب نے خود کوئی کتاب نہیں لکھی لیکن آزاد کی ہر کتاب پر ایک ناقدانہ تنہید یا دیباچہ لکھ کر ایک گونہ احسان کیا ہے۔ خصوصاً فلسفہ الہیات کا دیباچہ ”ادبی دنیا کے رہنما کی وجدانی زندگی کا ایک صفحہ“ لکھ کر انھوں نے حقیقت میں آزاد کی سہٹری کے دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔

”نکارستان فارس“ میں صفحہ ۲۳۴ پر ”عرض کیفیت“ کے عنوان سے طاہر صاحب نے ایک سرسری سا ذکر اپنے بہن بھائیوں کا کیا ہے۔ لکھتے ہیں ”میاں باوا مرحوم کے بعد والد مرحوم نے ان کے مسودوں کو کھولا۔ سرسری سی نظر ڈالی اور پھر یہ بستہ باندھ دیا کہ فرصت کے وقت دیکھیں گے۔ مگر تقدیر کا جگر دوز تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ فلک کج رفتار کو بھلا کب بھاتا تھا نصیبوں کا پھیر دیکھیے کہ اس سال میرے کٹر لیل جوان بھائی آغا محمد اسماعیل اسیر ام۔ اے کا

امتحان دیتے دیتے سرسام کا شکار ہو گئے۔ ان کی صف ماتم اٹھنے نہ پائی تھی کہ یکے بعد دیگرے دو جوان بہنیں ننھے ننھے بچے چھوڑ کر راہی ملک عدم ہوئیں۔ یہ زخم ابھی بھرنے نہ پایا تھا کہ یکایک مصیبت کا آسمان ٹوٹ پڑا۔ اور میرے دوسرے بڑے بھائی جوان مرگ آغا محمد یوسف خلیل بیا ہے تیا ہے سیروں غن ڈال کر جان بحق تسلیم ہوئے۔ غرض کہ ان پے در پے صدمات نے والد ماجد کو ایسا مضمحل کر دیا کہ پھر کبھی ان چیزوں کا نام ہی نہ لیا۔ آخر یہ تمام مرحلے طے کرنے کے بعد وہ بھی ۸۔ ۷ ستمبر ۱۹۲۱ء کو عارضۂ قلب کے بہانے اس بے وفا دنیا سے خفا ہو گئے اور دلی میں ۷

اپنے یوسف کے پاس دفن ہوئے چشم یعقوب میں کہاں نعیم
آغا محمد اشرف ایم۔ اے آزاد مرحوم کے پوتے محمد ابراہیم کے فرزند
 ارجمند ۱۹۱۲ء دہلی میں پیدا ہوئے ڈون اسکول ڈیرہ دون میں عربی و فارسی
 کے پروفیسر ہیں۔ مگر جب کبھی اپنے وطن مالوہ دہلی آتے ہیں آزاد کے قدیم مکان
 میں رہتے ہیں جہاں سے اردو کا سب سے پہلا اخبار نکلا تھا۔ سفران کی
 زندگی کا ایک دلچسپ مشغلہ ہے۔ نہ معلوم کب سے ان کے سفر کا سلسلہ جاری
 ہے لیکن جب آزاد مرحوم کے سلسلے میں میرا پہلا خط جناب کی خدمت میں پہنچا
 تو آپ اپنے مستقر پر تشریف فرما نہ تھے۔ ایک طویل انتظار کے بعد جواب آیا

دبچپ ہے اس لیے اسے بجنسہ نقل کیا جاتا ہے۔ ”میں جون ششہ میں سیاحت کی غرض سے ایران چلا گیا تھا۔ اور آج تقریباً دو مہینہ بعد دہلی واپس آیا تو آپ کا خط ملا۔ غالباً آپ کو جواب سے بالوسی ہو چکی ہوگی۔ میں آج ہی صبح سفر سے واپس آیا ہوں اور آپ کو رواروی میں جواب دے رہا ہوں۔ مولانا آزاد کے متعلق اب تک کوئی مستقل تصنیف نہیں چھپی۔ لیکن متفرق مقامات سے کافی مواد مل سکتا ہے“ اور چند ماخذ و حوالے دیے جن سے مجھے بڑی مدد ملی۔ اس سلسلے میں لکھتے ہیں ”مولانا آزاد ششہ میں سرکاری طور پر کابل و روس گئے تھے۔ اس کی تفصیل کسی کو معلوم نہ ہو سکی۔ البتہ گزشتہ سال ڈیرہ دون میں سروے آف انڈیا کے دفتر سے کچھ معلومات فراہم ہوئی ہیں جو میں ڈیرہ دون جا کر حاضر خدمت کر سکوں گا،“ مگر افسوس کہ وہ معلومات مجھے اب تک وصول نہ ہوئیں اور میرا مقالہ خاتمہ پر آگیا۔ اسی خط کو یوں ختم کرتے ہیں ”میرا ارادہ آئندہ سال انگلستان بفرض تعلیم جانے کا ہے۔ اور میرے مقالہ کا موضوع بھی آزاد ہیں۔ اس لیے مجھے آپ کے مقالہ میں بے حد دبچپی ہے۔ اگر آپ وقتاً فوقتاً مجھے اپنی معلومات سے آگاہ کرتی رہیں تو میں بے حد ممنون ہو نگا۔ ایک خواہش یہ اور ہے کہ اپنے مقالہ کی ایک نقل مجھے بھیج دیں تو باعث امتنان ہو گا۔“ علاوہ پروفیسری اور سیاحت کے آپ فلمی دنیا میں بھی کافی شہرت

رکھتے ہیں۔ چنانچہ ماہنامہ ساقی اکٹوبر ۱۹۳۷ء نمبر میں آپ کا ایک دلچسپ مضمون ایران کے سفر کے متعلق شائع ہوا ہے۔ جس کا عنوان ہے ”اُردو شاعری کے استعارے اور تشبیہات“ مضمون انا دلچسپ ہے کہ جی چاہتا ہے تمام کا تمام یہاں نقل کر دوں لیکن طوالت کا خیال مزاحم ہے۔ یہ ادبی شہ پارہ اپنے اندر شاعرانہ خصوصیات کا ایک ذخیرہ لیے ہوئے جلوہ گر ہوا ہے۔ اُردو شعرا نے ایرانیوں سے جو اپنے ادب کو مالا مال کیا ہے اس کا ایک مختصر خاکہ کھینچ دیا ہے۔ مثلاً :-

”باغِ ادب اس کے لہائے کا تخیل ہندوستان میں ایران ہی سے آیا۔
ایران والوں کو باغ اور بھولوں سے قدرتی محبت ہے۔ غریب سے غریب گھر میں
چلے جائیے تو وہاں بھی صحن میں ایک چھوٹا سا حوض ہو گا۔ حوض کے چاروں
طرف پھل دار درخت لگے ہوں گے۔ انگور کی بیلیوں نے اس کو گھیر لیا ہو گا۔
مجھے جمعہ کا دن شیراز، اصفہان اور طہران میں بسر کرنے کا اتفاق ہوا۔ اس
روز شہر کے کاروبار بالکل بند تھے۔ صرف چائے خانے اور نان بائیوں کی
دکانیں کھلی تھیں۔ حد یہ ہے کہ اس روز سفر کے لیے موٹریں بھی نہیں ملتی تھیں۔
اگرچہ شہر کے باہر رونق سب شہروں جیسی تھی۔ ایران میں خر کی سواری
کوئی عیب نہیں بلکہ قالین کی جھول ڈال کر بڑے بڑے رئیس اور شرفاء

خروں پر سوار ہوتے ہیں۔“

مزج زاد کی بہت تعریف کی ہے۔ یہ ایک گاؤں ہے، طہران سے، ۸ میل کے فاصلہ پر۔ وہاں کی چل پھل، رونق اور آبادی کو بڑے اچھے طریقے سے لکھا ہے۔ یادش بخیر اس مضمون میں مولانا آزاد نے ”سرخندان فارس“ میں ایرانی بلبل کے متعلق جو گہر فشانیاں کی ہیں اس کو دُھرایا ہے اور لکھا ہے۔

”زلف کی خوبی یہی تھی کہ سانپوں کی طرح کندھوں پر
بل کھائے۔ لیکن ۱۹۳۵ء سے اعلیٰ حضرت رضا شاہ پہلوی نے حکماً
تمام ایران میں مغربی لباس جاری فرادیلے۔ اس کے ساتھ زلف
بھی غائب ہو گئی۔ تمام ایرانی عورتیں اب مغربی طرز پر بال کٹواتی
ہیں۔ ہمارے شعراء نے ابرو کو خنجر اور کبھی محراب سے تشبیہ دی
ہے۔ لیکن ایران میں مغربی سیلاب نے محراب اور خنجر کی تشبیہ بھی
اڑادی۔ اب تو سینما اسٹار کی طرح ابرو کو تراش کر باریک اور
سیدھا بنایا جاتا ہے۔ جس کی تشبیہ دینا اب ہمارے شاعروں کے
بس کی بات نہیں رہی۔“

”ایران کے پانی میں قدرت نے شیرینی اس غضب کی

رکھی ہے کہ میوہ منہ میں رکھے تو شربت ہوا جاتا ہے۔ پھوک کا نام نہیں۔ - خربوزہ کاٹے تو شیرہ اور شربت پڑا ٹپکتا ہے۔ انگوروں کے خوشے جب ہیلوں سے اُتارتے ہیں تو دانے پھوٹ پھوٹ کر بہتے ہیں۔ گویا انگور نہیں رس کے بھرے ہوئے کونے ہیں۔ اس لیے لفظ شیرین سے بہت سی ترکیبیں بناتے ہیں جو ہماری زبان میں بھی رائج ہیں مثلاً شیرین سخن - شیرین دہن - شیریں کلام - خواہ شیرین وغیرہ۔

بہر کیف اشرف صاحب کا یہ سفرنامہ فنی اور ادبی دونوں حیثیتوں سے خوب ہے۔ خصوصاً ادبی حیثیت سے بہت اچھا ہے۔ اس کا کچھ حصہ آپ نے دہلی ریڈیو اسٹیشن سے نشر بھی کیا۔

غرض ماہنامہ ساقی آپ کی رشحات قلم سے وقتاً فوقتاً متمتع ہوتا رہتا ہے چنانچہ ساقی ستمبر ۱۹۳۷ء ”ناصر نمبر“ میں کچھ بھولی بسری باتیں ”کے عنوان“ کے تحت ایک مضمون دیا ہے۔ اس میں خان بہادر میر ناصر علی مرحوم کے متعلق کچھ واقعات ہیں جن کو لطائف و ظرائف سے دلچسپ بنایا ہے۔ ساقی ”دلی نمبر“ ۱۹۳۷ء میں ”غالب کی برسی“ کے لیے اہل ہند کو توجہ دلائی ہے۔ جون آف آرک اور شیکسپیر کی برسی جو منائی جاتی ہے ان کو گنایا ہے کہ پھر کیوں غالب حبیبی ہستی

گوشہ نگنما میں پڑی رہے۔

ساتی سالنامہ جنوری ۱۹۳۲ء میں ”ایران میں زر کاغذی کا پہلا تجربہ“ کے عنوان سے اپنے تجربہ کی باتیں لکھی ہیں۔ زر کاغذی جسے عرف عام میں ”نوٹ“ کہتے ہیں اس کے ہر پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کی غرض و غایت بتائی ہے۔ ”مذہب ایران“ کے عنوان سے قسط واری مضمون شاہجہاں میں دیتے رہے جو ۱۹۳۲ء میں دہلی سے نکلتا تھا۔ تقریباً دو سال ہوئے آپ دہلی سے خبریں بھی نشر کیا کرتے تھے۔ اور اس سلسلے میں حیدر آبادی سننے والے انھیں خطوط لکھتے۔ ان کی تقریر بہت پسند کی جاتی تھی۔ آپ کے ”آداب عرض“ کہنے کا طریقہ اتنا مونثر تھا کہ آپ کا نام ہی سننے والوں نے ”مولانا آداب عرض“ رکھ دیا تھا۔

آپ نے اصلاح دیہات کے سلسلے میں تین ڈرامے لکھے ہیں۔ ان کی ایک ایک کاپی مجھے بھجوائی ہے۔ جو بحیثیت مجموعی قدیم رسوم کا ایک اصلاحی سرمایہ ہے۔ ”ڈاکٹر صاحب“ قصہ کی شکل میں تعلیم بالغان پر ایک مختصر مگر بے مثل کتاب ہے۔ اردو میں اس قسم کی یہ پہلی تصنیف ہے۔ ضخامت ۴۳ صفحے۔ ”تری اہٹ اور دو ڈرامے“۔ ۶۸ صفحات کی ایک دلچسپ تصنیف۔ ڈرامے کی شکل میں۔

”مبادی المعاشیات“ معاشی نقطہ نظر سے ایک کارآمد تصنیف ہے۔

انھیں عموماً دہلی کے دیہاتی پروگرام میں بدل بدل کر نشر کیا جاتا ہے۔
میرے مقالہ کے سلسلے کا آخری خط صاحب موصوف نے گاندھی انٹر-
ورڈھا سے لکھا تھا۔ لکھتے ہیں۔

”میں آج کل وردھا میں سیر کی غرض سے آیا ہوا
ہوں۔ کل بلہار شاہ تک کوئلے کی کانیں دیکھنے گیا تھا۔ سنا
ہے کہ وہاں سے حیدرآباد کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ افسوس کہ
میں حیدرآباد کی زیارت نہ کر سکا۔ اب میں آج شب کی ٹرین
سے بمبئی جا رہا ہوں۔ وہاں سے ۳، ۴ روز بعد دہلی واپسی کا

قصد ہے۔“

آزاد کی شکل و شمائل | آزاد کی تصویر بہت عام ہے۔ اس کے دیکھنے

سے معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کے ظاہری محاسن میں سے انھیں کچھ نہ کچھ حصہ
ضرور ملا تھا۔ میانہ بلکہ پستہ قد۔ گندمی رنگ۔ چھریا جسم تھا۔ پیشانی
صفاے باطن کا آئینہ تھی۔ چہرے سے ذکاوت و فطانت نکلتی تھی۔ بشرو
سے کشادہ پیشانی۔ منہ کچھ نکلتا رس معلوم ہوتے ہیں۔ نگاہوں سے شہادت
رعب اور نود کی بارش ہوتی تھی۔ آنکھیں یوں بھی کیفیات قلب کا آئینہ

ہوتی ہیں۔ ان کی آنکھوں سے ان کے ضمیر کا خلاصہ معلوم ہو جاتا تھا۔ زبان میں وہ جادو۔ باتوں میں وہ سہانا سحر اور مٹھاس۔ انداز بیان میں ایسی شگفتگی و گیرائی کہ صحبت میں کوئی تھوڑی دیر بیٹھے تو اس پر ایک محویت طاری ہو جائے۔

عادات و خصائل | ان کی طبیعت قدرتا موزوں تھی۔ وہ بلا کے ذکی اور ذہین تھے۔ بال کی کھال نکالتے تھے۔ بذلہ سنجی میں اپنا آپ جواب تھے۔ طبیعت کی شگفتگی نے انھیں ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ ان کی تقریر کا جادو سننے والوں کے قلوب کو موہ لیتا تھا۔ ان کی تحریر میں جوش ہے وہ ان کی تقریر کا عکس ہے۔ اسی تیزم و شعریت کا یہ ایک خوشگوار پرتو ہے جو جا بجا اپنی جھلک دکھا کر دامن ادب کو مالا مال کر رہا ہے۔

طبیعت میں انتہائی غیرت تھی۔ ان کی تصنیفات کی شہرت و مقبولیت ان کی زندگی ہی میں ہو گئی تھی۔ لیکن ان کے دل کا سانچہ کچھ ایسا واقع ہوا تھا کہ اپنی کتاب کی تعریف تک خود سننا گوارا نہ تھا۔ گویا اپنے حالات کو دیکھ کر اپنے نفس کو موٹا نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

”احسنی کا قاعدہ ہے کہ اپنی تعریف سن کر خوش ہوتا ہے۔“

میرا یہ حق حد سے بہت گزر گیا ہے کہ تعریف سُن کر غصہ آتا ہے۔ بات یہ ہے کہ آپ میری تصنیف کے باب میں کچھ نہ کہا کریں۔ کیا کہوں فرصت تو ہے نہیں۔ اور دل یہ چاہتا ہے کہ آپ کے ایک ایک فقرے کے جواب میں ایک ایک کتاب لکھوں۔“

ایک اور جگہ ان کی غیوری طبع کی جھلک دیکھیے۔ اپنے شاگرد لالہ دونی چند کو لکھتے ہیں۔

”میرا یہ حال ہے کہ جب ڈاکٹر صاحب آئے تو میں ان سے کالج ہی پر ملا۔ استقبال کو اسٹیشن پر نہیں گیا۔ اور طریقہ یہی رکھا ہے کہ گھر پر بے بلائے نہ جانا اور زیادہ اختلاط نہ بڑھانا۔“

ایک جگہ اور جل کر لکھا ہے۔

”مضحکہ بھی غیرت والوں کے لیے کچھ اثر لکھتا ہے صاحب ہونا بے غیرتی کے بھی بہادر ہیں۔ لالہ دونی چند! میں بیزار ہو گیا اس لیے کہ مایوس ہو گیا۔ اور میرا قاعدہ ہے کہ جب میں مایوس ہو جاتا ہوں تو بیزار ہو جاتا ہوں۔“

آزاد مرحوم کی طبیعت انتہا درجہ محنت پسند واقع ہوئی تھی۔ یعنی ان کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے کہ جس سے ان کے عیش وطمینان سے بسر

کرنے کا دھوکا ہو سکے۔ ساری عمر ملک و قوم کی قلمی خدمت پر کمر بستہ رہے۔
 مولوی عبدالحق صاحب میرے ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں۔
 ”آزاد زود رنج تھے۔ ان میں رشک و حسد بھی تھا۔
 جب کسی کی طرف سے دل پر میل آجاتا تھا تو پھر نہیں نکلتا تھا۔
 ایسا سننے میں آیا ہے کہ بعض خانگی وجوہ ایسی تھیں کہ جن کی بناء
 پر وہ مومن سے خفا تھے۔ کچھ وجہ مذہبی اختلاف کی بھی تھی جب
 آب حیات شایع ہوئی تو مولانا حالی نے آزاد کو اس فروگزاشت
 کی طرف توجہ دلائی۔ جواب میں یہ لکھا کہ مجھے مومن کے حالات معلوم
 نہ تھے۔ اس لیے ان کا تذکرہ چھوڑ دیا۔ اگر آپ ان کے حالات
 لکھ بھیجیں تو آئندہ شایع کر دیے جائیں گے۔ آزاد کا یہ عذر
 بہت بھونڈا تھا۔ مولانا حالی نے کچھ واقعات لکھ کر بھیج دیے جس کا
 منشا یہ تھا کہ وہ انھیں اپنے رنگ میں ڈھال کر لکھ لیں گے۔ مگر
 آزاد نے بحسنہ وہ تحریر آب حیات میں درج کر دی۔ البتہ اس پر
 اپنی طرف سے شروع میں ایک نوٹ لکھ دیا۔ اس نوٹ میں
 ”ایک الطاف فرما“ کا جو فقرہ ہے۔ اس کا اشارہ الطاف حسین
 حالی کی طرف ہے۔“

اسی کی عالیجناب نواب صدر یار جنگ بہادر بھی اس طرح تائید فرماتے ہیں،
 موئن کا ذکر نہ کرنا ایک اجتہادی غلطی تھی۔“

مولانا محمد شفیع پروفیسر اور نیٹل کالج لاہور فرماتے ہیں -

”میں نے ان کے بعض شاگردوں سے سنا ہے کہ ان کے

مزاج میں ظرافت بہت تھی۔ وہ لطائف جو میں نے سنے ہیں ان

سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ طلباء سے غایت درجہ بے تکلفی برتتے

تھے شگفتہ مزاج و رنگین طبع تھے۔“

طبیعت میں انتہائی نفاست تھی۔ صفائی کے خوگر تھے۔ مزاج کی طرح لباس
 میں بھی سادگی ان کا شیوہ تھا۔ بڑے وضعدار تھے۔

مولانا آزاد کی انتہائی کسر نفسی اور منکسر المزاجی کا ثبوت ان کے

اس خط سے ملتا ہے جو انھوں نے حضرت ناصر نذیر فراق دہلوی کے نام

ان کی شاگردی اور اصلاح کلام کی درخواست پر لکھا۔

”دقیقہ آزاد کے بارہ میں جو آپ نیک خیالات رکھتے

ہیں اور جو گراں بہا الفاظ اس کے حق میں آپ نے صرف فرمائے

ہیں وہ اپنے درجہ کو اس سے بہت پست سمجھتا ہے اور شکریہ اس کا

نہ زبان سے بیان کر سکتا ہے نہ قلم سے رقم کر سکتا ہے۔ شاگردی کا

ارادہ جو آپ نے تحریر فرمایا ہے وہ اپنے کو اس لائق نہیں سمجھتا۔ علاوہ برائیاں استاد کو واجب ہے کہ شاگردوں کا حق بھی ادا کرے اور اس کا جو حال ہے دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔
 قسمیہ کہتا ہوں کہ اصلاً فرصت اصلاح نہیں ہے۔ امید ہے کہ آپ معاف رکھیں گے۔“

ایک دل و خیل آرزو دل بہ کجا کجا ہم سینہ تمام دماغ پنبہ کجا کجا ہم
 اس جواب صاف سے جس میں انکساری کوٹ کوٹ کر آزاد نے بھردی تھی ناصر صاحب کی بہت دل شکنی ہوئی اور وہ آبدیدہ ہو گئے۔ ان کے والد مرحوم نے یہ کہہ کر تسلی دی کہ مایوس مت ہو۔ اہل کمال کے بڑے دماغ ہوتے ہیں ایک دفعہ میں اقرار کر لیا کریں تو ان میں اور عام آدمیوں میں کیا فرق رہے۔ میں خود تمہیں لاہور لے چلوں گا اور خوش آمد در آمد سے۔ غرض جس طرح بن پڑے گا تمہیں آزاد کا شاگرد کروادوں گا۔ حسن اتفاق کی بات کہ ادھر لاہور کے منصوبے ہی ہوتے رہے کہ ایک دن مزارا یعسوب بیگ صاحب نے اچانک اگر ان کے والد سے کہا مولانا آزاد دہلی میں تشریف رکھتے ہیں۔ اور نواب پٹودی کی کوٹھی میں اترے ہیں۔ اس کو سن کر ناصر صاحب کہتے ہیں ”وہ خوشی مجھے آج تک یاد ہے“ شام کا وقت تھا ناصر صاحب

اپنے والد کے ساتھ درِ آزاد کی جبین سانی کی چلے۔ ان کے جاتے ہی آزاد
 تعظیم کو کھڑے ہو گئے۔ پس ناصر صاحب کے والد نے ناصر صاحب کا سر
 ان کے قدموں پر رکھ کر فرمایا۔ ”یہ سر ایک حسینی زادہ کا ہے اس کی لاج
 رہے۔“ اس جملہ کو سن کر مولانا کانپ گئے اور انھیں سینہ سے لگالیا۔ اور
 فرمایا ”آپ نے یہ کیا غضب کیا۔ ہم تو آپ کے بزرگوں کا کلمہ پڑھتے ہیں“
 اس پر ان کے والد نے کہا ”غضب تو آپ نے کیا کہ ایک کس سید زادہ کا
 دل توڑا کہ ہم تمھیں شاگرد نہیں کرتے“ مولانا آزاد اس فقرہ کو سن کر
 بہت پریشان ہوئے۔ اور فرمایا کہ ”واللہ میں اس جملہ کو بالکل نہیں سمجھا“
 ناصر صاحب کے والد نے ان کی تحریر بتائی۔ بہت خرمندہ ہوئے۔ اپنی
 انتہائی عظیم المرتبتی کا اظہار کیا اور کہنے لگے ”برائے خدا آپ معاف
 فرمائیں میں جب تک جیوں گا اس بے پروائی کی تلافی کرتا رہوں گا“ اور
 پھر ان سے پتہ وغیرہ دریافت کیا۔ بہت دیر تک گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔
 پرانی صحبتوں، مناظرہ و مباحثہ کے جلسوں۔ حضرت ذوق، غالب اور
 مومن کی پر لطف محفلوں کے تذکرے لال قلعہ کی آبادی کے قصے۔ غرض ایک
 دنیا جہان کی باتیں ہوتی رہیں۔ اسی صحبت میں ناصر نذیر فراق کو
 شرف تلمذ نصیب ہوا۔ ان کا کچھ کلام اور کچھ نثر وغیرہ دیکھ کر آزاد مرحوم

بھڑک گئے اور کہنے لگے ”یہی جناب میرا صاحب اب میرے اوپر بھی لازم ہو گیا ہے کہ میں اس سیدزادہ کو آزاد ثانی بنادوں“ اسی طرح سالہا سال تک اصلاح جاری رہی۔

ناصر صاحب لکھتے ہیں۔

”اگرچہ مجھے نظم و نثر میں سلیقہ پیدا نہ ہوا اور اب کیا ہوگا لیکن الحمد للہ بے استاد انہیں ہوں۔ ایک کامل استاد کا دامن میرے ہاتھ میں ہے۔ اور اس کا مجھے بڑا فخر ہے۔“

کھانے کا شوق | کھانے پینے میں انتہائی یا کیزگی برتنے تھے۔ کھانا بھی نہایت تمیز اور صفائی سے کھاتے۔ دسترخوان کی صفائی کا خاص طور پر لحاظ رکھتے۔ برتن وغیرہ ان کے سامنے میلے نہ آسکتے تھے۔ کھانے میں ذائقہ کا بہت خیال تھا۔ خوش خوراک تھے۔ سبز ترکاریاں بڑے شوق سے کھاتے۔ خصوصاً پودینہ کی چٹنی ان کے ہر کھانے پر ہوتی۔ گرمی میں تربوز اور برف بڑی پسند سے کھایا کرتے تھے۔ آم بھی انھیں بے حد پسند تھے۔ مولوی فرحت اللہ صاحب فرزند منشی ذکاء اللہ مرحوم نے اس ضمن میں بڑے دلچسپ حالات لکھے ہیں۔ مولانا کے تربوز کھانے کا طریقہ یہی نہرلا تھا۔ بڑے اہتمام سے اس کو نوش جان کرتے۔ تربوز لانے والے سے

کہتے کہ صراحی لائیو اور صراحی بھی شہیدی ہو۔ یعنی بے حد سرخ اور شیریں۔
 پھر اس کو بڑے تکلف سے تراش کر اس کی قاشیں ایک صاف ستھرے
 چینی کے پیالے میں ڈالتے۔ برف اور قند ملا کر کھاتے۔ نصف کھاتے اور
 نصف چھوڑ دیتے۔ تڑبوز کھا کر نمک اور کالی مرچیں بہت کھاتے تھے۔
 یہ اُلج کے جنون کا گویا آغاز تھا۔ جب کہ انھوں نے گوشت بھی کھانا چھوڑ
 دیا تھا۔ اس وہم میں کہ جانور کے بجائے مجھے آدمی کا گوشت کھاتے ہیں۔
 وہی انھیں بہت پسند تھا۔

آزادی دہلی کالج میں تعلیم

دہلی ایک جامع الصفات شہر تھا۔ آزاد کی تعلیم و تربیت دہلی کالج کے ادبی آغوش میں ہوئی۔ یہ وہی کالج ہے جہاں سے حالی۔ نذیر احمد۔ منشی ذکا، اللہ۔ ماسٹر پیارے لال آشوب جیسے باکمال لوگ پڑھ کر نکلے اور انھوں نے آسمان ادب پر اپنی معرکہ الآرا شخصیتوں سے چا۔ چاند لگا دیے۔ یہ ادب کے ان سرستوں کے جتھے نے اس گتھی کو سلجھا دیا ہے کہ جہاں ادب ہے وہاں زندگی کا شباب ہے، زینت ہے، رعنائی ہے۔ دہلی کو ایک شمع سے تشبیہ دینا چاہیے جس کے حسن عالم افروز نے ایسے ایسے سربراہوں پر وانوں کو متاثر کیا جن کے دم قدم سے اردو ادب کا سکھ طول و عرض عالم پر بیٹھ گیا۔ اس کالج کے سلسلے میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ جب مسٹر کوپ نے مشرقی شعبے کی چار جماعتوں کو مضمون دیا۔ تو جہاں انگریزی میں موتی لال کا مضمون بہ لحاظ زبان اور بہ لحاظ طریقہ بیان سب سے بڑھ کر رہا وہاں محمد حسین آزاد کا مضمون اردو میں سب سے بہتر خیال کیا گیا۔ اس کو پڑھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ بہت سی معلومات اس میں ایسی کتابوں سے حاصل کی گئی تھیں

جو نصاب تعلیم میں داخل تھیں اس کی وجہ یہ تھی کہ اس طالب علم کا تعلق دہلی گزٹ یا دہلی اُردو اخبار سے تھا۔ مطالعہ کی وسعت، عام معلومات کا ذخیرہ اتنا اس میں بھر دیا تھا کہ اس سے ان کی علمی پہنائی کا بخوبی اندازہ لگتا تھا۔ اور ایسی مفید معلومات بہم پہنچائی تھیں کہ تجھیں اُردو اخبارات و رسائل پڑھنے کی عادت ہو انھیں کا دامن ان پھولوں سے بھر سکتا ہے۔ اور ہر وقت ایک نئی دلچسپی پیدا کرنا تو آزاد کا ادنیٰ کرشمہ تھا۔

آزادی کی آزادی | آزاد واقعی اسمِ باسْمیٰ تھے۔ چستانِ ادب کے اس سرو آزاد نے ہمیشہ سماج کے نمائشی ڈھکوسلوں سے اپنی زندگی الگ تھلگ بسر کی۔ کسی قسم کی ملکی یا قومی تحریک، انجمن، ایسوسی ایشن کے ممبر نہیں ہوئے۔ نہ کسی درباری مدح سرائی سے اپنے قلم کو آلودہ کیا۔ قومی دملکی کام ان کی زندگی کی روحِ روان تھے لیکن ان کی شہرت بحیثیت ایک قومی لیڈر یا کسی سوشل مقرر کے نہیں ہوئی۔ ان کے علم و ادب کی شہرت ان کے کارناموں کی بقبولیت محض ان کے ذاتی جوہر اور اصلی معیار کی وجہ سے ہوئی۔ ہمیشہ نمود و نمائش سے پرے ہٹ کر اوقاتِ بسر کی۔ قوم و ملک کی اصلاح کے لیے ان کا قلم ہمیشہ ہمیشہ رواں دواں رہا لیکن نام نہاد لیڈری اور نمائشی ممبرشپ کی پیچیدگیوں میں کبھی خود کو انھوں نے نہیں الجھایا۔

انھوں نے خود سرسید کے نام ایک خط میں لکھا ہے۔
 ”میں اپنی تمام کوشش تمام طاقت وقت بلکہ اپنی جان و
 مال کو اپنے پیارے ہم وطنوں کے کام پر قربان کرنے تیار ہوں
 اور چاہتا ہوں کہ جو خیالات صلاح و اصلاح اور تہذیب و تعلیم
 کے رکھتا ہوں انھیں لکھوں اور پھیلانوں طالب علمی سے یہ میرا
 ارادہ اور دلی آرزو تھی۔ مجھے ہرگز کسی ملکی یا مالی عہدہ کی طمع و ہنگام
 نہ ہوئی۔“

خدا سے چاہتے ہم بھی تو تاج زر لیتے مگر ہوا نہ گوارا یہ بار سر لینا
 عمر گراں بہا کا بڑا حصہ سر رشته تعلیم کی ابتدائی کتابوں کی تصنیف
 میں صرف ہوا۔ وہ کتابیں نام کو ابتدائی ہیں مگر مجھ سے انھوں نے
 اتنا سے بڑھ کر محنت لی۔ جاننے والے جانے ہیں کہ جب تک انسان
 خود بچہ نہ بن جائے تب تک بچوں کے مناسب حال کتاب نہیں لکھ سکتا
 بڑھا ہو کر بچہ بننا پڑا۔ پھرتے چلتے سوتے جاگتے بچوں کے ہی خیالات
 میں رہا۔ مہینوں نہیں بلکہ برسوں صرف ہوئے جب وہ بچوں کے کھانے
 تیار ہوئے۔ میں نے اہل وطن کی خدمت نہ کی ان کے بچوں کی خدمت کی۔“

دہلی کو خیر باد کہتے ہیں | آزاد کا بچپن اور لڑکپن جتنا بے فکری و خوشحالی

میں بسر ہوا اتنا ہی جوانی کا زمانہ پہاڑ کی طرح ان پر ٹوٹ پڑا۔ غدر کے وقت
یہ شکل ۲۶، ۲۷ برس کے تھے کہ جلاوطنی نے قدم چومے اور یہ چل پڑے۔

لکھنؤ ہوتے ہوئے وہاں کے مشاہیر سے ملتے جلتے رہے۔ کچھ عرصے تک اس طرف
و جوانب میں سفر کیا۔ ایک مدتِ مدید کے بعد ۱۸۶۴ء میں تقدیر راہ پر آئی۔

اور آزاد لاہور پہنچے۔ یہاں پہنچ کر آپ سرکاری ملازمت میں داخل ہو گئے۔

آپ کی زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ لاہور ہی میں بسر ہوا۔ انجنینئر کے
جلسوں کا انھیں بانی کہنا چاہیے کہ انھیں کے دم قدم سے ان مفصلوں کی رونق بازار
قائم تھی۔

سفر | دہلی کو کیا چھوڑا کہ پاؤں میں گردش پر کارا لگئی۔ سفر ان کی
زندگی کا ایک حصہ بن گیا۔ ۱۸۶۵ء میں بکار سرکار کلکتہ کا سفر کیا۔ پھر پنڈت
من پھول کے ہمراہ کابل و بخارا گئے۔ ۱۸۷۱ء میں دوبارہ ایران کا سفر کیا۔ وہیں
جب لاہور آئے تو پھر یہیں کے ہو رہے۔ پھر تو مر کے ہی اٹھے۔

ملازمت | جب آزاد وادی پنجاب ہوئے تو پہلے پہل مولوی رجب علی صاحب
کے پاس جگوانون میں مقیم رہے۔ پھر مولوی صاحب کے ذریعہ سے لفٹننٹ گورنر
کے میٹری پنڈت من پھول صاحب کے پاس آئے۔ اور منشی صاحب کی سفارش سے

لاہور میں ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم کے دفتر میں (۱۵) ماہوار کے ملازم ہو گئے۔
 خشکی کے عالم میں یہ جگہ بھی ڈوبتے کوئٹے کا سہارا تھی۔

آزاد کی قسمت اس وقت جاگی جب ان کی رسائی اپنے قدیم ہم مدرسہ
 ماسٹر پیارے لال آشوب کے توسط سے محکمہ تعلیمات صوبہ پنجاب کے میجر فلر کے
 پاس ہوئی۔ میجر کو عربی اور فارسی سے خاص دلچسپی تھی۔ اردو سے بھی وہ اچھی
 طرح واقف تھا۔ آزاد کو اس نے کسی لسانی شبہہ کو دور کرنے کی غرض سے بلوایا۔
 ملنے کے بعد ان کی علمیت سے وہ بہت متاثر ہوا۔ اور اسی کے اثر نے آزاد کے لیے
 اردو اور فارسی کی درسی کتابیں لکھنے کی خدمت پیدا کی۔

شمس العلماء کا خطاب | وکٹوریہ کی جولائی کے موقع پر انھیں ہندوستان

میں سب سے پہلی مرتبہ شمس العلماء کا خطاب ملا۔ جس کے ساتھ گورنمنٹ کی
 طرف سے پانچ سو روپیہ سالانہ قلمدان کا خرچ ملتا تھا۔ لیکن یہ انھوں نے
 نہیں لیا۔ اور اس رقم سے مستحق طالب علموں کو وظیفے دیے۔ اب تک گورنمنٹ
 کالج لاہور میں فارسی کے بہترین ایم۔ اے کو ایک نفرتی آزاد ملتا ہے۔
آزاد کا حافظہ | حافظہ بلا کا تیز تھا۔ مختلف موقعوں کے شعر جتنے انھیں
 یاد تھے کسی کو اتنے یاد نہ تھے۔ ان کا تذکرہ آب حیات، جو اردو شاعری کی
 ایک پر لطف تاریخ، گھلاوٹ اور شیرینی کا ایک انمول سرمایہ ہے زیادہ تر ان کی

ذہنی یادداشت کا نتیجہ ہے۔

بیماری | مکتوبات آزاد کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ آزاد نے بڑی سختیاں جھیلیں۔ بواسیر ایک کہنہ مرض بن کر انھیں لاحق ہو گئی تھی۔ مرض ہر نیانے الگ ان کی صحت میں ایک غیر اطمینانی دبے کیفی پیدا کر دی تھی۔ پھر ایران کے سفر میں اونٹ سے گر پڑنے کا سانحہ جس سے ان کی پسلی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ اس بے سرو سامانی میں یہ واقعہ گزرا کہ صرف قدرت الہی نے جراحی کی۔ پسلی تو جڑ گئی لیکن گرہ رہ گئی تھی، جو مدت العمر باقی رہی۔

آزاد کی دیوانگی | یہ آزاد مرحوم کی درخشان زندگی کا نہایت عبرتناک پہلو ہے۔ اپنی اکلوتی صاحبزادی کے اچانک فوت ہو جانے سے وہ فائر لٹقل ہو گئے تھے۔ اس صدمہ نے اتنا اثر کیا کہ ان کی صحت بھی بگڑ چلی اور دنیا سے بھی ان کا جی اچاٹ ہو گیا۔ ان کی دیوانگی کے بہت پہلے کا ذکر ہے کہ ان کا ایک دلچسپ مشغلہ تختی کے ذریعہ سے روحوں کو بلانا تھا۔ کچھ دنوں بعد اسے پھینک دیا۔ اور بغیر کسی خارجی مدد کے خود فرماتے کہ فلاں جگہ کی روح آئی ہے۔ پہلے خود کچھ سوالات کرتے۔ پھر کچھ دیر کے لیے خاموش ہو جاتے۔ پھر آپ ہی آپ تعجب کے لہجے میں کہنے لگتے ”اچھا! تو یوں ہے“ یہ سب باتیں اس وقت کی ہیں جب کہ یہ گورنمنٹ کالج لاہور میں لکچرار تھے۔ دوست

جواب سے میل جول قائم تھا۔ لیکن طبیعت میں ایک ٹٹک سی پیدا ہو چلی تھی۔ اور اکثر اوقات تنہائی میں آپ ہی آپ باتیں کیا کرتے۔ اسی عالم میں ایران کا سفر کیا۔ وہاں سے آئے۔ اکبری دروازہ کے باہر کتب خانہ آزاد کی بنیاد ڈالی۔ ظاہر میں یہ سب کچھ تھا لیکن باطن میں دوسرا ہی رنگ غالب رہتا تھا۔ بیٹی کی موت سے تو سارے اوسان جاتے رہے۔ دنیا سے جو تھوڑا بہت لگاؤ تھا وہ سب رفع دفع ہو گیا۔ دنیا کی بے شافی کا نقش دل و دماغ پر ہمیشہ کے لیے بیٹھ گیا۔ شمع کے لگ بھگ لاہور میں ایک درویش سید دھیان شاہ چشتی تشریف لائے، جو کبھی سالک تھے کبھی مجذوب۔ پاس ہی نوین کوٹ میں قیام کیا۔ آنے جانے والوں سے صاحب سلامت بھی کر لیتے۔ لیکن بعض اوقات بالکل آپے سے باہر ہو جاتے اور خدا جلنے کیا کیا سنا دیتے۔ عموماً لوگوں سے بات نہ کرتے تھے۔ مولانا کو بھی گردشِ تقدیر ادھر لے گئی۔ سید صاحب بہت محبت و شفقت سے ملے۔ جو کچھ نذرانہ یا پیش کش مولانا لے جاتے وہ قبول فرما لیتے۔ بعد چند راز و نیاز کی محفلیں گرم ہونے لگیں۔ ان کا جو نتیجہ ہونا چاہیے تھا بہت جلد ظہور میں آگیا۔ مولانا آزاد بایں ہمہ علم و فضل، دیوانگی و وارفتگی کے ہم درج ہو کر محبت کے کوچہ و بازار میں رسوائی کا متغہ لگائے پریشانی کا پٹکا باندھے،

جذبِ کامل کا علم ہاتھ میں لیے با آواز بلند یہ شعر پڑھتے ہوئے مارے مارے
پھرا کرتے۔

اگرنی کا ہے گناں شک ہے ملاگیری کا رنگ لایا ہے ڈوپٹہ ترا میلہ ہو کر
ایک دن مولنا کالج سے پڑھا کر نکلے تو بجائے گھر آنے کے نوین کوٹ
چلے گئے۔ ابھی چند قدم کا فاصلہ تھا کہ سید صاحب نے نظر اٹھا کر دیکھا
مسکرائے اور فرمایا ”جا محمد حسین جاتیرے لیے دہلی کا حکم آیا ہے دلی چلا جا“
خدا جانے اس نگہ میں کیا جادو تھا، جس نے آزاد کو اپنا اسیر بنا لیا۔ گویا یہ
بات جو سید دھیان شاہ کے منہ سے نکلی ایک بجلی تھی جس نے صبر و سکون،
ہوش و حواس، تمدن و وضع داری، علمیت و تجربہ کاری سب کو چشمِ زدن میں
جلا کر خاکِ سیاہ کر دیا۔ اس جسمِ خاکی میں وہ کیفیت کی لہر وڑادی جس کی ادنی
جولا نگاہ دار و رسن ہے۔ صحرا نوردی اور دشتِ پیمائی جس کے ادنیٰ ترین
کرشمے ہیں۔ الغرض ع

بہ منئے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغان گوید

کے بمصداق آزاد اسی وقت پیدل دلی کی طرف چل پڑے۔ پٹیا لہ ہوتے
ہوئے جنگلِ بیا بانوں سے گزرتے ہوئے دلی پہنچے۔ مگر دیکھیے کس شان سے
پہنچتے ہیں۔ عمامہ غائب، جو تاندارد، حالم میسر۔ تمام دلی میں شور

مج گیا کہ محمد حسین آزاد اس صورت سے وارد شہر ہوئے ہیں۔ رشتہ دار
 منتیں کرتے کہ چلیے ہمارے گھر چل کر رہیے۔ مگر وہاں سننا کون تھا۔
 کبھی قدم شریف کبھی استاد ذوق کی قبر پر کبھی شہر کبھی منگل جانتے۔
 بہت بھوک لگتی تو کسی دوکان سے مٹھی بھر چنے اٹھالیے وہ بھی کئی کئی دن
 بعد۔ آخر منشی ذکا اللہ کے گھر آئے۔ جن کی دھن میں لاہور سے نکلے
 تھے۔ وہیں ٹھکانہ بنایا۔ جس وقت آزاد منشی صاحب کے گھر پہنچے ہیں
 صاحب موصوف تشریف نہ رکھتے تھے۔ جب باہر سے آئے اور سنا کہ آزاد
 اس حالت کو پہنچتے ہوئے یہاں پہنچے ہیں اور ان کو دیکھا تو بے اختیار
 رو دیے۔ ان کو کئی دن تک مہان رکھا ہر قسم کی ناز برداری اٹھائی۔
 دوستی میں وہ برتاؤ کیا کہ آج کل کے رشتہ داروں سے بھی یہ ناممکن ہے۔
 تھوڑے دنوں بعد پھر محمد ابراہیم صاحب چند لوگوں کو لے کر دہلی آئے
 اور انھیں سمجھا کر لے گئے۔

مرحوم کو منشی صاحب کے فرزندوں سے بھی دلی غلوں تھا۔ ان
 بچوں سے بے حد محبت کرتے تھے۔ ان کے جنون میں بھی ایک ضابطہ موجود
 تھا۔ مضمون لکھتے تھے اور درسی کے نیچے چھپا دینے تھے۔ مولوی فرحت اللہ صاحب
 فرزند منشی ذکا اللہ لکھتے ہیں کہ ہم ان کے مضامین جو وہ چھپا دیتے تھے

پڑھنے کی کوشش کرتے لیکن اس کے سمجھنے کے لیے ہماری عقل قاصر تھی۔ کیونکہ ہماری عمریں دس دس بارہ بارہ سال کی تھیں۔ فرحت صاحب اکثر ان کے پاس جایا کرتے۔ وہ انھیں کانون دار کہہ کر بلاتے تھے۔ ان کا باقاعدہ کھانا ان کا انتہائی سلیقہ، ان کی فطری صفائی یہ ایسی چیزیں تھیں جن کو ان کا مختل دماغ بھی دور نہ کر سکا۔

اس عالم میں بھی تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری تھا۔ سپاک و ناگ اور فلسفہ الہیات اسی دور کی یادگار ہیں۔ کیونکہ عالم جنون میں بھی صفائے باطن کی وجہ سے ان کا شغل یادِ خدا، عالم بے خودی اور الہیات تھا۔ اس زمانے میں یہ اپنی بیوی کے بھی دشمن ہو گئے تھے۔ کہتے تھے کہ میری بیوی مجھے آدمی کا گوشت کھلاتی ہے۔ اسی وہم میں گوشت کھانا بالکل ترک کر دیا تھا۔

انہیں ایام میں ایک مرتبہ آپ رائے بہادر ماسٹر پیارے لال سے ملنے آئے دو تین گھنٹے تک ملاقات کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن بار بار یہی الفاظ ان کے وردِ زبان تھے ”رائے صاحب آپ اس شعر کو پڑھا کیجیے۔ اس کے معنی آپ جو چاہیں سمجھ لیں۔“

پردہ در کعبہ سے اٹھا دینا ہے آساں پر پردہ رخسار صنم اٹھ نہیں سکتا۔

اس عالم دیوانگی میں بھی ان کی تحریر کا لطف انوکھا اور پیرایہ بیان نرالا ہے۔ دیوان ذوق کے چھینے کے بعد جب ایک کاپی ان کے پاس رکھی گئی اور خاتمہ لکھنے کی ان سے درخواست کی گئی پہلے تو کئی دن تک انکار کرتے رہے۔ لیکن آخر نہ معلوم کیا جی میں آیا کہ خود ہی قلم دوات لے کر ایک صفحہ لکھ دیا۔ جو دیوان ذوق کے خاتمہ پر درج ہے۔ اس میں اور صحتِ ہوش و حواس کی تحریروں میں کوئی بھی تو فرق نہیں البتہ اس میں تصوف اور الہیات کی چاشنی ملی ہوئی ہے۔ بقول مؤلف نمنخانہ جاوید ”اس بگڑی ہوئی حالت میں بھی جب کبھی قلم دوات کے نصیب کھل جاتے تھے تو عجیب عجیب گلِ فتانیاں کرتے کہ اب کوئی ذی ہوش ایسی گلِ کاریاں نہیں دکھا سکتا“

اصلاح کا واقعہ | منشی ذکار اللہ مرحوم سے آزاد کو انتہائی خلوص تھا۔

حد ہو گئی کہ ایک مرتبہ یہ ان سے ملنے پیدل لاہور سے دہلی آئے۔ اور اپنے گھر پر اطلاع تک نہ چھوڑی۔ منشی ذکار اللہ نے ان کی بہت خاطر اور محبت کی۔ اسی زمانے کا ذکر ہے کہ ایک دن منشی صاحب اصلاح بنوا رہے تھے کہ آزاد اس طرف اتفاق سے آنکھ ”یہ نائی خط بنانا کیا جانے میں بنائو گا“ یہ کہا اور نائی سے استرا لے کر خط بنانا شروع کر دیا کہ اتنے میں منشی صاحب

کے ایک دیرینہ دوست ننھے خاں صاحب مرحوم آگئے۔ وہ یہ واقعہ دیکھ کر
 نشتر و حیران ہو گئے۔ مگر خاموشی سے اس منظر کو دیکھا کیے۔ جب مولوی صاحب
 حجامت بنا کر فارغ ہو گئے۔ اور نائی کو استرا دے کر کمرے میں چلے گئے،
 تو ننھے خاں صاحب منشی صاحب سے کہنے لگے ”واہ واہ، خوب مولوی صاحب
 تو پاگل تھے ہی مگر تم ان سے بڑھ کر دیوانے ہو کہ ایک پاگل شخص کے ہاتھ میں
 استرا ہے اور تم نے اپنا گلا اوپر چہرہ ان کے سامنے کر دیا۔ اگر وہ تمہارا گلا کاٹ
 دیتے یا ناک اڑا دیتے تو میاں جب کیا کرتے۔ منشی صاحب یہ فقرے سن کر
 مسکرا دیے۔ اور بڑی متانت سے فرمایا۔ ”بھئی جیسا ہمارا دوست پاگل
 ویسے ہم پاگل۔ ہم دونوں بچپن کے سچے دوست ہیں۔ وہ مجھ کو کبھی کوئی
 آزار نہیں پہنچا سکتے۔ سچی محبت ہر حالت میں یکساں رہتی ہے۔“

آلنٹ صاحب کا ذکر | ایک دن مشن کالج چلیںے۔ وہاں پادری

آلنٹ صاحب موجود تھے۔ ان سے ملے۔ ان کو کیا خبر کہ یہ پاگل ہو گئے ہیں۔
 انھوں نے ایک فلسفہ کی کتاب کا ترجمہ کرایا تھا وہ مولوی صاحب کو دکھایا۔
 اور اس پر ان کی رائے پوچھی۔ مولوی صاحب نے بجائے کچھ کہنے سننے
 کے مسودہ کے چند اوراق پھاڑ پھوڑ پھینک پھاہک وہاں سے چلتے بنے۔
 پادری صاحب حیران کہ یہ کیا ان کی حرکت تھی۔ آلنٹ صاحب نے منشی

ذکاء اللہ مرحوم سے ان کی شکایت کی کہ نہ معلوم کیوں انھوں نے ایسی حرکت کی۔ منشی صاحب نے کہا کہ مولوی صاحب تو پاگل ہو گئے ہیں۔ یہ سُن کر آئنٹ صاحب کو بہت افسوس ہوا۔

آزاد کو دیوانگی میں دیکھنے والے | اس کیف و استغراق کی حالت میں جن اصحاب کو ان سے شرف ملاقات نصیب ہوا ہے ان میں سے یہ قابل ذکر ہیں مولانا عبد اللہ عمادی صاحب مترجم عربی سرشتہ تالیف و تراجم جواباً اپنے کرم نامے میں ارقام فرماتے ہیں۔

”آزاد مرحوم سے پہلی مرتبہ سن ۱۳۱۸ء میں شرف نیاز حاصل ہوا تھا۔ اختلال کے باعث اگرچہ ذہنیت متغیر ہو چکی تھی تاہم افادات و استفادات کے کافی مواقع مل سکتے تھے۔ اختلال ذہن کے زمانے میں بھی دلی جاتے تو دن دن بھر استاد ذوق کی قبر پر گزار دیتے۔“

پروفیسر محمد شفیع اور بینٹل کالج لاہور اپنے گرامی نامہ میں رقم طراز ہیں۔
 ”سن ۱۳۱۸ء میں جب میں لاہور بغرض تعلیم آیا تو مرحوم زندہ تھے۔ مگر جنون میں مبتلا۔ اس زمانے میں وہ سیر کے لیے باغوں میں نکلتے تھے۔ کئی بار میں نے ان کو دیکھا۔ سن ۱۳۱۸ء کے

ابتدائی مہینوں میں ایف - اے کا امتحان قریب تھا اور میں شیران والی دروازے کے باہر ایک باغ میں فارسی کو رس پڑھ رہا تھا سکند زمانہ کا انتخاب اس نصاب میں شامل تھا۔ میں اس حصہ کو دیکھ رہا تھا کہ آزاد سیر کرتے ہوئے ادھر سے گذرے کسی شعر میں مجھ کو اشکال کا سامنا تھا۔ میں ان کی طرف بڑھا اور سلام کر کے شعر کے معنی پوچھے۔ جہاں میں نے اس شعر کو پڑھا انھوں نے اس مقام کے متعدد اشعار زبانی پڑھ دیے۔ اور مطلب بھی بیان کیا۔ دیوان ابوالعلاہیہ (عربی) بھی نصاب میں داخل اور اس وقت میرے پاس موجود تھا۔ اس میں سے میں نے ایک شعر پوچھا جس میں ”سلیم“ (یعنی لدینغ) آیا تھا۔ فرمایا اس لفظ کے معنی یاد نہیں۔ ہمارے ہاں آؤفت میں دیکھ کر بتائیں۔ وہ اکثر باغوں میں گھومتے رہتے۔ چلتے چلتے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپ سے باتیں کیے جاتے ہیں۔“ مولانا حسن نظامی صاحب دیباچہ مکتوب آزاد میں لکھتے ہیں :-

”آخری ایام میں جب استاد عالم استغراق میں تھے اور دیوانی دنیا ان کو دیوانہ کہتی تھی میری نظروں نے بھی دیکھا۔ ڈاکٹر غلام نبی زبدۃ الحکماء کی کوٹھی میں بیٹھا تھا، جو شہر لاہور کے باہر واقع ہے۔

دیکھا ایک سفید ریش بزرگ سفید عمامہ باندھے کلڑی ہاتھ میں لیے
 خراماں خراماں چلے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا یہی آزاد
 ہیں۔ بے تاب ہو کر دوڑا کہ زیارت کا شرف حاصل کروں۔ وہ
 تیزی سے چلتے گئے مگر بہت کر کے اُن کے قریب پہنچ گیا۔ تعاقب نے
 پہلے تو ان کو نیز خراماں کر دیا تھا قریب دیکھا تو ٹھہر گئے۔ اور مڑ کر
 دیکھا۔ میں نے جھک کر سلام کیا۔ انھوں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر
 دعا کی۔ اللہ تم کو خوش رکھے کہ مجھ جیسے آدمی کو سلام کرتے ہو۔
 میں نے عرض کیا۔ زیارت کا بے حد اشتیاق تھا۔ فرمانے لگے لعنت
 ہے اس شخص پر جس نے تم کو میرا مشتاق بنایا۔ یہ کہا اور پوری
 تیزی سے روانہ ہو گئے یہ پہلی ملاقات تھی۔ اور یہی آخری کہ اس
 کے بعد کبھی دیدار میسر نہ آیا۔“

آزاد کے متعلق یہ خواجہ صاحب کا خیال ہے جن کو ”مصور فطرت“ کہتے ہیں۔
 ان کا پر لطف انداز میں لکھا ہوا دیباچہ دیکھ کر میں نے انھیں خط لکھا اور ان کے
 کچھ حالات پوچھے تو حضرت نے اس ایک ہی جملے سے میرا منہ کیل دیا۔
 ”میں حضرت آزاد دہلوی کے ذاتی حالات بالکل نہیں جانتا

ورنہ تعمیل ارشاد کرتا“

ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی نسبہ میر درد مرحوم کی ایک دلچسپ روایت سے جو مکتوب آزاد میں حسن نظامی صاحب کے دیباچہ کے بعد واقع ہے آزاد کی مجنونانہ زندگی پر کچھ روشنی پڑتی ہے فرماتے ہیں :-

”سنہ ۱۹۰۹ء میں یکا یک خیال آیا کہ ایک بار لاہور چل کر مولانا کی زیارت پھر کر لو۔ ایسا نہ ہو خدا نخواستہ مولانا اس جہان سے رحلت کر جائیں۔ اور یہ آنکھیں آخری دیدار سے بھی محروم رہیں۔ اس خیال کا آنا اور میرا ۱۲ مارچ جمعہ کو لاہور چل دینا۔ انارکلی مسجد شفیق کی سرائی میں ٹہرا۔ ۱۳ مارچ اکبری دروازہ مولانا آزاد کی دولت سرا پر پہنچ گیا ایک ہنساری مولانا کے امام باڑہ کے نیچے ہی دکان میں بیٹھتا ہے میں نے اس سے پوچھا آغا محمد ابراہیم صاحب کہاں ہیں۔ اس نے کہا وہ تو جگر اُون ہیں۔ میں نے کہا ان کے کوئی صاحبزادہ کہا آغا محمد یوسف گھر میں ہیں۔ پھر میرے دستک دینے پر آغا محمد یوسف مرحوم کو ٹھٹھے پر سے نیچے اُتر آئے۔ وہ مجھے کیا پہچانتے۔ دیکھنا بے بالا۔ پھر میں نے اپنا مدعا سنایا کہ آپ کے دادا جان کی قدبوسی کے لیے ہٹی سے آیا ہوں فرمایا امام باڑہ میں بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ گئے استاد امام باڑہ کے برآمدہ میں بیٹھے تھے اور جس

ہنیت سے بیٹھے تھے اسے دیکھ کر میرا کلیجہ منہ کو آگیا۔ ایک میلی سی
 اچکن گلے میں تھی جس کی چولی میں پورے بٹن بھی نہ تھے۔ ایسا ہی
 میلا کچھا ڈبل زین کا پیجامہ تھا۔ سر پر مغلیٰ وضع کی چکٹ ٹوپی اور
 پاؤں میں بہت ہی بوسیدہ جوتی تھی ایک بوریہ پر بیٹھے تھے۔ ایک
 مٹی کی رکابی میں شورباتا تھا اور ایک چنگیر میں چائیاں تھیں چپاتی
 کا نوالہ بنا کر شوربے میں ڈبوئے تھے اور اسے منہ میں رکھ لیتے تھے۔
 اور دیر تک چبا کر مشکل سے نگل جاتے تھے۔ بوریہ کے ادھر ادھر
 کچھ راکھ کچھ کوئلے اور کچھ کوڑا پڑا تھا۔ میں نے کہا سبحان اللہ
 یہ وہی منظر ہے جو حضرت نے آب حیات میں سید انشاء اللہ خاں
 کے آخری دور میں لکھا تھا۔ مجھے دیکھ کر فرمایا تم کون ہو۔ میرے
 نام بتانے پر فرمانے لگے ”بھئی میں تمہیں نہیں پہچانتا“ میں نے
 کہا میں آپ کا شاگرد ہوں۔ فرمایا اچھا اگر تم میرے شاگرد ہو تو

۱۔ خدا کی شان یہ وہی آزاد ہیں جو آب حیات میں اپنی نگین بانی اور نفاست طبع سے مجبور
 ہو کر حکیم آغا جاں عیش کے لیے لکھتے ہیں۔ ان کی سرخ و سفید رنگت پر گلے میں تل کا
 کرتا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے چمیلی کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہے۔
 (مضمون نگار)

گرم جلیبیاں تولے آؤ میں نے اسے بڑی سعادت سمجھی ۔
 دوڑا دوڑا گیا۔ گرم جلیبیاں تو نہ ملیں ٹھنڈی لایا اور سامنے
 رکھ دیں۔ ایک جلیبی اٹھائی اور فرمایا بھلا میرے ہلتے ہوئے
 دانتوں سے ٹھنڈی جلیبیاں کب کھائی جائیں گی۔ اچھا اٹھاؤ
 میں نے اصرار کیا تو گبڑ نے گئے۔ آغا محمد یوسف نے کہا زیادہ نہ
 کھیے نہیں تو برا بھلا کہیں گے۔ پھر کہا اچھا جاؤ یہاں سے ۔
 میں اور آغا صاحب امام باڑے کے صدر دروازہ میں آکر
 ایک تخت پر بیٹھ گئے۔ آغا صاحب نے پان سے تواضع فرمائی
 پھر میں نے مولانا کی زدہ حالت پر اظہار افسوس کیا اس پر
 آغا صاحب نے فرمایا، حضرت گور کا عذاب مردہ ہی خوب
 جانتا ہے۔ اگر دسترخوان میں روٹی لائی جاتی ہے تو دسترخوان
 حلا دیتے ہیں چینی کی رکابیوں میں سالن دیا جاتا ہے تو انہیں
 توڑ کر پھینک دیتے ہیں۔ تانے کی رکابیاں دیکھیے تو بازار
 میں جا کر بیچ آتے ہیں یا کسی راہ چلتے کو دے دیتے ہیں ،
 سیکڑوں برتن غارت ہو چکے ۔ اچھے اور ستھرے کپڑوں سے
 بیرہے ۔ ادھر پہنائے ادھر پھاڑے ۔ اتنے میں کیا دیکھتا

ہوں کہ خلل کرتے ہوئے امام باڑہ میں سے چلے آئے ہیں مجھے دیکھ کر فرمایا
 ہیں بھی تم کب دلی سے آگئے۔ واللہ میں نے تمہیں اس وقت
 نہیں پہچانا تھا۔ یہ کہہ کر تخت کے نیچے کا سہارا لے کر بیٹھ گئے۔
 مسکرائے لگے۔ میں نے کہا آپ نے مجھے پہچان لیا۔ فرمایا ہاں
 میاں تمہارا نام سید ناصر ندیر ہے۔ اس بات کو سن کر میں
 نہایت خوش ہوا اور آغا یوسف بھی حیران ہو گئے۔ میں نے
 حضرت کے مزاج کو راہ پر دیکھ کر کہا۔ میں نے ایک تازہ سلام
 کہا ہے وہ سنا نا چاہتا ہوں۔ فرمایا پڑھو۔ میں نے سلام
 پڑھنا شروع کیا۔ جو شعر پسند آتا تھا اس پر خوش ہو کر فرماتے
 تھے یہ خوب کہا ہے اور جو پسند نہ آتا تو فرماتے یہ کچھ نہیں۔
 جب میں نے سلام کا مقطع بھی پڑھ دیا تو فرمایا تمہارا سلام تو
 بہت ہی اچھا ہے مگر کہیں کہیں جو میں نے یہ کہہ دیا تھا کہ
 یہ کچھ نہیں۔ یہ شعر کی بندش کے لحاظ سے کہا ہے۔ میں نے
 کہا درست ہے۔ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ مگر کبھی کبھی
 بے ڈھنگے پن کی بھی کہہ جاتے تھے۔ پھر کیا ایک اُٹھے اور
 بازار کے طرف چل دیے۔ پھر زندگی میں مورنا کو دیکھنا نصیب نہ ہوا۔“

سنا ہے کہ انہیں ایام بے خودی میں ایک روز مولنہ نے بہت سے مسودات کا پلندہ اٹھالیا اور دریا برد کر آئے۔

وفات | آخر اسی حالت بے خودی و محویت و جنون میں ۲۲ جنوری ۱۹۱۷ء مطابق ۹ محرم الحرام ۱۳۳۷ھ کو حضرت آزاد قید ہستی کی صعوبتوں سے آزاد ہو گئے۔ حضرت کیفی دہلوی لکھتے ہیں۔

”جس طرح وینس کو بائرن کی آخری آرام گاہ ہونے کا فخر حاصل ہے اسی طرح لاہور کو ان کی جائے مزار ہونے کا اعزاز رہے گا۔“

آزاد کی قبر بھاٹی دروازہ کے باہر گامے شاہ کی کربلا میں واقع ہے یہ مقام گورنمنٹ کالج کے پاس داتا گنج بخش کے مزار کے متصل ہے۔ یہاں پر آزاد اکثر سیر کرنے آتے تھے اور یہ جگہ انہیں بہت پسند تھی۔

قبر پر ایک چھوٹا سا گنبد سنگ مرمر کا ہے۔ جس پر سنہری کلس بہت خوشنما معلوم ہوتا ہے۔ مزار پر سید محمد محسن صاحب متین کا تصنیف کردہ قطعہ تاریخ کندہ ہے۔ اس اردو کے مسیحا کی تاریخ رحلت حکیم سید ناصر زید فراق دہلوی نے یہ کہی ہے :-

حضرت آزاد والا مرتبت چون زد دنیا کرد ناگہ روبہ غلہ

حوریاں را شادمانی در گرفت جشن فرخ کردہ شد ہر سوبہ خلد
کالمے از شہر دہلی در رسید سکۂ خود می زند اُردو بہ خلد
اللہ اللہ علّٰہ استاد من می فشانہ دم بدم خوشبو بہ خلد

بہر تاریخ و مصالح از فراق

عرشیاں گفتند رفتہ او بہ خلد

۱۳۲۸ھ

مولانا حالی نے بھی تاریخ وفات لکھی تھی جس کے اشعار یہاں درج کیے جاتے ہیں:-

آزاد وہ دریائے سخن کا درِ لکھا جس کی سخن آرائی پہ اجماع تھا سب کا
ہر لفظ کو مانیں گے فصاحت کا نمونہ جو اس کے قلم سے دم تحریر ہے ٹپکا
ملکوں میں پھر مدنوں تحقیق کی خاطر چھوڑا نہ دقیقہ بھی کوئی رنج و تعب کا
دیکھا نہ سنا ایسا کہیں اہل قلم میں تصنیف کا۔ تدوین کا تحقیق کا لپکا
صحت میں، علالت میں، اقامت میں ہر جگہ ہمت تھی بلا کی تو ارادہ تھا غضب کا
فرض اپنا ادا کر کے کئی سال سے شقائق بیٹھا تھا کہ آئے کہیں پیغام طلب کا
آخر شب عاشور کو تھی جس کی تمنا آہنچا نصیبوں سے بلا واسعے رب کا

تاریخ وفات اس کی جو پوچھے کوئی حالی

کہہ دو کہ ”ہو اخاتمہ اُردو کے ادب کا“

اساتذہ اور احباب

ذوق سے تلمذ | یوں تو انشا پردازی کا چسکا آزاد کو اپنے کالج کی دیواروں کے اندر ہی پڑ چکا تھا۔ اپنی جماعت میں سب سے اول رہنا ان کا پیدائشی حق تھا۔ دیوان ذوق اور دیباچہ آب حیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ذوق نے آزاد کی طبع رسا اور ذہن خداداد کو خوب پرکھ لیا تھا۔ آزاد، ذوق کے سب سے زیادہ ہونہار اور چھپتے شاگرد تھے۔ ذوق کو آزاد سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں اور حقیقت میں آزاد نے ان کی امید کو حد سے زیادہ پورا کر کے دکھا دیا۔

مولوی محمد باقر کا بچپن سے شیخ محمد براہیم ذوق سے کچھ ایسا غلوں تھا کہ یہ دوستی آج کل کے رشتوں سے زیادہ مضبوط و مستحکم ہو گئی تھی۔ اس لحاظ سے ذوق آزاد کو اپنا حقیقی بھتیجا سمجھتے تھے۔ یوں بھی آزاد کو طالب علمی کے زمانے سے ہی اپنے استاد کے اشعار کو اپنی بیاض میں لکھنے کا شوق تھا۔ اس کے علاوہ وہ ذوق کا کلام جہاں کہیں بھی پاتے تھے صندوق سینہ میں محفوظ کرتے جاتے تھے۔ ان سے زیادہ اور تو اور خود ذوق کے

پاس بھی ان کے کلام کا مجموعہ نہ تھا۔

ذوق کی شخصیت نے ان پر عمیق اور وسیع نقش چھوڑا تھا۔ جب وہ

ان کا ذکر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے پیر و مرشد کا بلکہ اپنے دیوتا

کا ذکر کرتے ہیں۔ آب حیات میں ان کے حالات کیا لکھے ہیں بلکہ ذوق کے

پرستش کا سامان فراہم کر دیا ہے۔ دیوان ذوق کا دیباچہ اس انتہائی

محبت کی شہادت کے لیے ایک مستند سند ہے۔

آزاد نے آنکھ کھولتے ہی ذوق کو دیکھا۔ انہیں کے سایہ عاطفت میں

تعلیم و تربیت پائی۔ ذوق تھے تو آزاد کے استاد لیکن محبت و شفقت کے

محاط سے ان کے احباب میں سے تھے۔

حکیم آغا جان عیش سے | ذوق کے مرنے کے بعد حکیم آغا جان عیش کے
فیض صحبت سے فائدہ اٹھایا۔ بقول مولانا

عبداللہ عمادی صاحب

”ادب کی تکمیل آغا جان عیش سے ہوئی۔ مگر عہد طفولیت

استاد ذوق کے زیر سایہ تربیت بسر ہوا۔ اس لیے عمر بھر

یہ ذوق نہ گیا“

حکیم آغا جان عیش | آزاد نے ان کو پہلی مرتبہ ذوق کے ساتھ مشاعرہ میں

دیکھا تھا۔ اس تصویر کو آنکھوں میں رکھا۔ استاد کے مرنے کے بعد ذوق سخن نے آزاد کو ان کے حضور میں پہنچا دیا۔ گو حکیم صاحب ذوق کے ہم پلہ نہ تھے تاہم ان کے اہل کمال ہونے میں کچھ شبہ نہ تھا۔ آب حیات صفحہ ۴۸۲ میں آزاد نے ان پر ایک نوٹ دیا ہے۔ ان کا حلیہ لکھتے ہوئے لباس کا ذکر کرتے ہیں۔

”گلے میں ملل کا کرتا جیسے جمیلی کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہے۔“

آغا محمد اشرف بھی حکیم صاحب کے ”لمذ کی اس طرح تائید کرتے ہیں۔

”کالج کی تعلیم ختم کرنے کے بعد گھر کے چھاپہ خانے اور

اخبار کا کام سنبھالا۔ اتنے میں استاد ذوق کا انتقال ہو گیا۔

پھر یہ دہلی کے ایک اور استاد حکیم آغا جان عیش کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔“

اجاب | ان کے دوست بہت کم تھے لیکن جتنے تھے ان سے بے حد تعلقاً

تھے۔ مکتوبات آزاد دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے کس قسم کے خط لکھے ہیں اور کن کن کو لکھے ہیں۔ مثلاً منشی ذکاء اللہ صاحب سے ان کا خلوص کہ آزاد لاہور سے پیدل ان سے ملنے دلی آئے۔

شمس العلماء خان بہادر مولوی منشی ذکاء اللہ صاحب دہلی کی ان مایہ ناز ہستیوں میں سے ہیں جن پر مسلمان ہزاروں سال فخر کریں گے۔ آپ مولانا

آزاد کے ہم درس اور ہم راز دوست تھے۔ آپ دہلی کے بہت مشہور ریاضی کے ماہر تھے۔ پیدائش کا سنہ ۱۸۳۲ء ہے۔ اس لحاظ سے آزاد ان سے صرف ۲ سال کے بڑے تھے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد دہلی کالج میں داخل ہوئے۔ مختلف موضوعات پر ان کی تصانیف ہیں مثلاً ریاضی، تاریخ جغرافیہ، سیاست مدن، علم اخلاق وغیرہ۔ ان کی تعداد (۱۴۳) ہے جو ۱۸۵۲ء سے لے کر ۱۹۱۱ء تک کی کمائی ہے۔

ان کی طبیعت ہمہ گیر واقع ہوئی تھی۔ ہر مضمون پر روانی و عالمانہ روش سے بے تکان لکھ سکتے تھے۔ ان کی اس وسعتِ معلومات کو دیکھ کر مولانا حالی نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ:-

”آپ کا دماغ بنیے کی دکان ہے۔ جس کو جس چیز کی

ضرورت ہوئی وہاں سے مل گئی“

نہایت کریم النفس، وسیع الاخلاق، فیاض طبع اور روشن دماغ تھے۔ ان کے فرزند مولوی غنایت اللہ صاحب حیدر آباد میں دارالترجمہ کے ناظم رہ چکے ہیں اور اب کچھ عرصہ سے ڈیرہ دون میں سکونت اختیار کر لی ہے۔ مرحوم کے اور دو فرزند مولوی رضا، اللہ صاحب و فرحت اللہ صاحب دہلی میں مقیم ہیں۔ منشی صاحب مرحوم کا انتقال ۷ نومبر ۱۹۱۱ء دہلی میں ہوا۔

میسر سید حسن بلگرامی | آپ نواب عماد الملک مرحوم کے چھوٹے بھائی تھے۔ عربی۔ فارسی، اردو اور ترکی زبان کے لسانی ادیب تھے۔ اور قومی درد رکھنے کی وجہ سے مسرید مرحوم کے ساتھ خاص تعلقات رکھتے تھے۔ ۱۹۱۳ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۱۵ء میں انتقال کیا۔

حکیم محمد دین صاحب | لاہور سے ملا ہوا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے وہاں کے رہنے والے تھے۔ علمی و ادبی ذوق اس قدر تھا کہ رات دن تحصیل علم میں ہی مصروف رہتے تھے۔ علم کی بے شکاں شوق حد سے زیادہ بڑھا ہوا تھا۔

مولانا سید ممتاز علی مرحوم | ان سے بھی آزاد مرحوم کے گہرے تعلقات تھے۔ ان کے فرزند سید امتیاز علی صاحب تاج میرے خط کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:-

”پروفیسر آزاد سے والد ماجد کے بہت زیادہ تعلقات

تھے لیکن دونوں میں خط و کتابت کبھی نہیں ہوئی۔ اور ہوتی

کیونکہ۔ دونوں لاہور ہی رہتے تھے۔ اور تقریباً روز کا ملا جلا

تھا۔ ایسی صورت میں خط و کتابت کا کوئی موقع نہ تھا۔“

انہیں تعلقات کی بناء پر مولانا نے آزاد کی دربار اکبری اپنے زیر اہتمام طبع فرمائی اور اس طرح حق دوستی ادا کیا۔

ڈاکٹر لائٹنر | ایک صاحب بہادر تھے پہلے گورنمنٹ کالج کے پرنسپل تھے۔ پھر ڈائریکٹر رہے۔ پھر یونیورسٹی کے رجسٹرار ہو گئے۔ اول اول مولانا آزاد پر بہت مہربان تھے۔ پھر خفا ہو گئے۔ پھر من گئے۔ آخر سب میں سنٹرل ایشیا میں پولیٹیکل خدمات پر بھی گئے تو مولانا کو ساتھ لے گئے۔ تاریخ سین اسلام بڑی محنت سے لکھوائی تھی۔ مگر ایک دفعہ سے دوبارہ نہ چھپ سکی۔ اچھی چیز تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے نام نے مولانا کی محنت کو خاک میں ملا دیا۔ اگر مولانا خود اپنے نام سے چھپواتے تو کئی بار چھپ چکی ہوتی۔

شاگردوں سے تعلقات | آج کل عام طور پر طلباء اور مدرسین میں وہ عقیدت و شفقت ناپید ہے جن سے آزاد کے شاگرد دوچار ہوئے۔ وہ صدمہ فوجوان جن کو گورنمنٹ کالج لاہور میں آزاد سے شرفِ تلمذ حاصل ہوا تھا، ان سب کو اسی نظر سے دیکھتے تھے۔ جس نظر سے افلاطون، ارسطو، کو، مرزا غالب، تفتہ کو اور مومن کی شیفتگی شیفۃ سے تھی۔ اکثر شاگرد تو ان کے ایسے تھے جنہوں نے باوجود فارغ التحصیل ہونے کے حصولِ محبت میں ان سے معقول استمداد حاصل کی۔ اس سے ان کے عادات و خصلت کی خوبی کا بخوبی اندازہ لگتا ہے۔ شاگردوں کی کرویدگی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ استاد کا خلوص کس درجہ پر پہنچا ہوا تھا۔ نیز ان کے خطوط سے

معلوم ہوتا ہے کہ اپنے شاگردوں سے بہت محبت کرتے تھے اور ہر طرح ان کی مدد کرنے پر کمر بستہ رہتے تھے۔ چنانچہ مکتوبات آزاد میں ان کے ایک شاگرد بلالہ دونی چند وکیل، جو بعد میں پنجاب کانگریس کے لیڈر ہو گئے تھے، ان کو ملازمت دلوانے کے لیے آزاد بار بار افسروں سے ملے اور آخر کار انھیں نائب تحصیلدار نامزد کروا دیا۔ ان کے علاوہ ان کے اکثر شاگرد ان سے وظیفہ پاتے تھے جو انھوں نے کبھی واپس نہیں لیا۔

حکیم ناصر نذیر فراق دہلوی | ان کی شاگردی کا حال ان کی دیوانگی کے باب میں بصراحت درج ہے۔

آزاد کی تصانیف

ذیل میں شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد کی تصانیف کی جو اس وقت تک شایع ہو کر مقبول عام ہو چکی ہیں مکمل فہرست دی جاتی ہے۔ یہ فہرست اس لیے درج کی جاتی ہے کہ جو نمونے اس سے قبل دیے گئے ہیں وہ محض آزاد کی تصانیف کے دریا کے چند قطرے ہیں مکمل آزاد اپنی مکمل تصانیف کے بغیر نہیں مل سکتے۔ بہر کیف ہم آزاد کی تصانیف کو ادبی نقطہ نگاہ سے تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) جو ابتدائی درجوں کے لیے درس و تدریس کی خاطر مخصوص ہیں۔

(۲) جو موصوف کی ادبی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔

(۳) جو خللِ دماغ کے زمانے کا سرمایہ ہیں۔

زمانے کے لحاظ سے بھی نظم و نشر کے علاوہ موصوف کی تصانیف دو حصوں میں تقسیم ہو سکتی ہیں۔ ایک وہ جو ان کے زمانہ حیات میں چھپ چکی ہیں اور دوسری وہ جو ان کی حیات کے بعد طبع ہوئیں اس کا حال مختصر نوٹ میں دکھایا جائے گا۔

مولانا کی قدراں کے معاصرین شبلی، سرور، سرسید، منیر احمد، ذکا، حالی، آشوب، وغیرہ کی نگاہ میں شاعر و ناثر دونوں حیثیت سے بہت زیادہ تھی۔ جس میں مولانا کی تقریر کی انشا پر داذی بھی حصہ رکھتی تھی۔ شبلی نے تو جوشِ عقیدت و محبت سے بے چین ہو کر آزاد کو مجددِ شاعر اور ادیب کے ساتھ ”خدائے اردو“ کہہ دیا ہے۔ کچھ بھی ہو آزاد ”ناخدائے اردو“ ضرور ہیں۔

(۱)

پہلی صنف کی کتابیں حسبِ ذیل ہیں :-

فارسی	اردو
ابتدائی } جماعتوں کے لیے } (۱) فارسی کی پہلی (۲) فارسی کی دوسری	(۱) اردو کا قاعدہ (۲) اردو کی پہلی ابتدائی } جماعتوں کے لیے } (۳) اردو کی دوسری (۴) اردو کی تیسری (۵) اردو کی چوتھی (۶) قصص ہند
اعلیٰ درجے کے لیے } (۳) جامع القواعد	

ان کتابوں کی مشترک خوبیاں یہ ہیں :-

(۱) زبان نہایت سادہ مطالب آسان اور طرزِ تحریر دلچسپ ہے۔

(۲) سادگی اور دلچسپی برابر بڑھتی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ بچے آسانی اور شوق کی وجہ سے استاد کی مدد کے بغیر بھی آگے کا سبق پڑھ کر کچھ لیتے ہیں اور تیار کر لیتے ہیں۔

(۳) اردو کی تعلیم کے لیے آزاد کی ان کتابوں کے پہلے طلباء کے لائق ایسی مرتب آسان اور دلکش کتابیں نہ تھیں مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کی اردو کی پہلی، دوسری، تیسری، چوتھی اور پانچویں کتابیں بہت بعد لکھی گئی ہیں۔

ان کتابوں کی ہمہ گیر مقبولیت کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ پنجاب ٹرسٹ بک کمیٹی نے ان سب کو منظور کر لیا اور اب تک بعض کتابیں داخل نصاب ہیں۔ مندرجہ ذیل کتب پر مقالہ ہذا میں تنقید کی گئی ہے۔

۱۔ نیرنگ خیال (۲ جلد) ۱۸۸۰ء

۲۔ آب حیات ۱۸۸۳ء

۳۔ مکتوبات آزاد ۱۸۸۷ء

۴۔ دیوان ذوق ۱۸۹۰ء

۵۔ دربار اکبری ۱۸۹۸ء

۶۔ سخن دان فارس ۱۹۰۷ء

۷۔ ننگارستان فارس ۱۹۲۲ء

۸۔ سیرایران

۹۔ فلسفۃ الہیات ۱۹۲۲ء

۱۰۔ سپاک و نناک ۱۹۲۷ء

۱۱۔ نصیحت کا کرن پھول

۱۲۔ نظم آزاد ۱۸۹۹ء

ان کے علاوہ آزاد مرحوم کی یہ کتابیں بھی ہیں۔

۱۔ ڈرامہ اکبر (جلال الدین محمد اکبر شہنشاہ ہند کے نورِ نظر جہانگیر و

نور جہاں کے افسانہٴ محبت کو سب سے پہلے ڈرامہ اردو کا

لباس پہنا کر پیش کیا ہے ۱۹۲۲ء)۔

۲۔ نعت آزاد ۶۔ کائناتِ عرب

۳۔ بیاضِ آزاد ۷۔ تذکرہٴ علماء

۴۔ آموزگارِ پارسی ۸۔ قواعدِ اردو

۵۔ جانورستان ۹۔ خلمدہٴ آزاد

آب حیات | آب حیات آزاد کا ایک مہتمم بالشان اور لافانی شاہکار

مثنوی کا حصہ ہے۔ جس کی ضخامت ۵۵۲ صفحے ہے اس تذکرہ میں شعراء اور مصنفین کے حالات
زبان الہامی بھرے پڑے ہیں مگر شعراء کے نسبتاً زیادہ ہیں۔ یہ تذکرہ اردو زبان کا بالکل
انوکھا اور جدید تذکرہ ہے۔ اس کی زبان ایک طرح سے الہامی زبان ہے اس کو
پڑھنے سے طبیعت اکٹا نہیں جاتی تسلسل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا یا یوں
کہیے کہ آزاد کا قلم خیالات کی روانی میں ان کا ساتھ چھوڑنا نہیں چاہتا۔

یہ جدید طرز کا سب سے پہلا تذکرہ اور اپنے وقت کے سارے تذکروں
میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے قبل شعراء کے کلام پر یا تقریظیں
ہوتی تھیں یا اس کی تعریفیں۔ آزاد نے سب سے پہلے تنقید کا راستہ نکالا اور
حتی الامکان تحقیق اور تدقیق سے کام لیا۔ بڑی محنت اور کاوش سے حالات
جمع کیے۔ روایات اکٹھا کیں۔ اور جزئیات کو محققانہ انداز سے جما کر واقعات زندگی

ترتیب دیے، عادات، اطوار، خصائل، جال حلیں، علمی تجربہ، احوال خصوصیات
کلام، غرض ہر ایک ضروری بات کا پتہ چلایا اور آنے والوں کے لیے فن تنقید کا
دیا روشن کر دیا۔ تنقید نگاروں اور تذکرہ نویسوں نے اس پر بعض قسم کے اعتراضات
کیے ہیں لیکن ہر شخص اپنی رائے دینے اور اپنے خیالات ظاہر کرنے کا حق رکھتا ہے۔
اس لیے میری ذاتی رائے یہ ہے کہ آب حیات کی تنقیدیں اور آب حیات کا تنقیدی بیانیہ

اپنی آپ نظیر ہے۔ اگر اس کے تنقیدی پیرایہ میں کوئی سقم ہے تو اس قدر کہ اس میں تنقیدی زبان کی بجائے افسانوی زبان استعمال کی گئی ہے اب رہی واقعات اور جزئیات کی صحت تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ مولانا آزاد سے جو شعراء کے تذکرے کے پہلے مدون تھے، مورخانہ انداز اور انہی شدید صحت کی توقع رکھنا خلاف عقل و انصاف بلکہ ایک زیادتی ہے۔

آب حیات کی زبان ہے کہ جادو، سحر ہے کہ افسوں، گھنٹوں پڑھتے چلے جائیے اکتانا تو درکنار جی ہی نہیں بھرتا۔ اردو کے کسی اور ادیب یا انشا پر داز کی زبان اس زبان سے لگا نہیں کھا سکتی۔ نہ مولانا حالی کے ہاں یہ شوخی اور طرافت ہے نہ سرسید کے ہاں یہ رنگینی و لطافت نہ اکبر کے ہاں یہ علمی وقار و متانت ہے۔ نہ نذیر احمد کے ہاں وہ اختصار و زور ہے۔ اور نہ منشی ذکاء اللہ کے پاس وہ حسن و نزاکت ہے۔ غرض آزاد کا تیکھا پن اور ان کے قلم کا جادو، بس انہیں کا حصہ ہے۔ اس چابک دست مصوٰر ادب نے نثر میں نظم کی روح بھر دی ہے۔

اردو زبان میں آب حیات کی زبان کو ایک خاص نمایاں اور ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ زبان کا منتر دیکھیے کہ کتاب ہاتھ میں لیتے ہی پڑھنے والا عبارت کی دل فریبیوں میں کچھ ایسا محو ہو جاتا ہے کہ دنیا و

ما فیہا کی خبر نہیں رہتی۔ یہ حالت خود پڑھنے والوں پر بیسیوں مرتبہ گزری ہے۔ کہ کسی خاص شاعر کے حالات دیکھنے کے لیے پڑھنا شروع کیا تو بس گھنٹوں گزر گئے۔ کہاں سے کہاں جا پہنچے اور اصلاً خبر نہ ہوئی کہ کہاں جانا تھا اور کہاں ٹہرے ہیں۔ جب کسی خارجی سبب سے اس کی زبان کا طلسم ٹوٹا تو کہیں پتہ چلا کہ پڑھنا کچھ تھا اور پڑھ گئے کچھ۔

یوں تو آرٹ کی ہر تقلید ایک نئی دنیا ہے۔ آزاد نے اپنی شاعرانہ نوک جھونک سے اس نثری گلدستہ کو قسم قسم کے پھولوں سے سجایا ہے۔ محاکات شاعری کے ہر ٹوک پلک سے اس دلہن کو آراستہ کیا ہے جس کے زلف پر بیچ میں شاعری پھولوں کے مار کی طرح اُبھ کر رہ گئی ہے۔ اس سلسلہ میں مجھے اس جگہ کو دھرانا چاہیے جو مولانا عبد اللہ عمادی صاحب نے ارقام فرمایا ہے۔

”آب حیات کے مسودے میں نے دیکھے ہیں۔ یہ

زبان میں واقعات لکھے ہیں بعد کو مرصع فرمایا ہے“

حسن نظامی صاحب آب حیات کی نسبت کیا کلفشانی کرتے ہیں۔

”آب حیات شعراء کا تذکرہ بھی ہے اور بزم مشرق

کی آخری بہار کا افسانہ بھی“

اس تذکرے کے آٹھ دس ایڈیشن اب تک نکل چکے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے دلکش جملے اور ان کا مترنم توازن، خوبصورت آسان ترکیبیں اور سریع الفہم تشبیہیں مصد الفاظ، نرم و شیریں انداز بیان، نھری ہوئی دہلی کی زبان، یہی وہ نئی ہفت آتش ہے جس کے خار میں پڑھنے والا اپنی سدھ بدھ کھٹھتا ہے۔ اور ان کا غذی تحریروں میں اتنا محو ہو جاتا ہے کہ خود کو بھی تھوڑی دیر کے لیے اسی دنیا میں محسوس کرنے لگتا ہے۔

آزاد کی تحریر اپنی آپ نظر ہے۔ مگر آب حیات اور قصص ہند ان کے شاہکار ہیں۔ شگفتگی، شوخی، زور، رنگینی، حسن اور دلکشی۔ ان کی تحریر کی خصوصیات ہیں۔ فارسی اور عربی کے ثقیل الفاظ، پیچیدہ ترکیبیں، دورازکار تشبیہیں، صنائع بدائع کا لایعنی دفتر، بیجا تکلفات و تصنیفات سے ان کی نثر پاک ہے۔

آب حیات کی زبان میں ایک خاص موسیقیت ہے۔ جس کی ترنم ریزیا
دل و دماغ کو مست کیے دیتی ہیں۔ غرض آب حیات و حقیقت آب حیات
ہے۔ جس کی زبان مردہ دلوں میں اُنگ اور زندگی پیدا کرتی ہے پھر
لطف یہ ہے کہ کہیں ابتداء نہیں۔ سو قیام نہ رنگ نہیں۔

دوست تو دوست دشمن بھی آب حیات کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ اس کی

زبان کی سحر طرازیوں نے ایک عالمگیر شہرت اختیار کر لی ہے۔ اور یہی زبان ہے جس کی بدولت آزاد آج تک مقبول خاص و عام ہیں۔ اپنی طرز کے آپ موجد ہیں۔ انگریزی زبان کے ماہران فن بھی اس معیار کمال پر مشکل سے پورے اترینگے۔ ڈیکوئٹسی، لیب، وغیرہ، معدودے چند نثری آزاد کی جادو نگاری کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ آزاد کی وفات پر ندوہ کے ماتمی جلسہ میں شبلی مرحوم آب حیات کو بغل میں دبائے آئے اور فرمایا۔

”آج جس شخص کا ماتمی جلسہ ہے اس کی اس تصنیف کو

میں نے ۱۸ مرتبہ پڑھا۔“

آب حیات کی شب اور شبستان کے خیالات اپنے اندر ایک گنج گراں مایہ رکھتے ہیں۔ الفاظ کی پھبن اپنی دلکشی کا جواب نہیں رکھتی۔ مثلاً

”فلک تیر حوادث کا ترکش اور کمان کہکشاں لگاے

کھڑا ہے۔ اگر عاشق کا تیر آہ اس کے سینہ کے پار جاتا ہے پھر

بھی زحل منخوس کی آنکھ نہیں پھوٹی کہ عاشق کی صبح مراد ہو یا وفا

شمع عشق کے تپ میں سراپا جلتی ہے۔ اس کی چربی گھل گھل کر

بہتی ہے۔ مگر پائے استقامت اس کا نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ

سرخسہ سحری کبھی آکر کافور دیتی ہے اور کبھی تباہ شیر شمع کا

دل اس کے لیے بھی گداز ہے کہ شب زندگی کا دامن بہت چھوٹا
 ہے۔ لیکن صبح دونوں کے ماتم میں گریباں چاک کرتی ہے بچہ
 آفتاب فلک کے سبز گھوڑے پر سوار کرن کا تاج زرنگار سر پر
 رکھے شفق کا پھریرا اڑانا ہوا اپنے حریف شاہ انجم کی فوج کو
 پریشان کر کے فتح یاب آیا ہے۔“

یہ تو ایک رات اور دن کا سماں تھا۔ اب ان کی بھاشا کے باغ کی
 بہار دیکھیے۔ فارس کے ادیب کے مقابلہ میں بھاشا کے انشا پرداز کا سلیفہ
 بتاتے ہیں کہ وہ برسات میں اپنا باغ کیسے سجاتا ہے۔

”دورختوں کے جھنڈ چھائے ہیں۔ گھن کے پتے ہیں۔ ان
 کی گہری گہری چھاؤں ہے۔ جامن کی ہٹنیاں آم کے پتوں میں
 کچھڑی ہو رہی ہیں۔ کھرنی کی ہٹنیاں فالسے کے درخت میں بھیلی
 ہوئی ہیں۔ چاندنی کی بیل کمرک کے درخت پر لپٹی جاتی ہے۔
 عشق تیج کی ہٹنیاں گلروندے پر ایسی چھائی ہیں جیسے سانپ
 لہرا رہے ہیں کسی ہٹنی پر بھونرے کی آواز۔ کسی میں کھیلوں کی
 بھنبھناہٹ الگ ہی سما باندھ رہی ہے۔“

اس کیف و سرور سے اس قصہ کو ختم کرتے ہوئے برکھارت کی بہار

دکھاتے ہیں۔ پھر شام کا سماں اور رات کی اُداسی میں شرارے بھائے
ہیں مثلاً :-

”آدھی رات اِدھر آدھی رات اِدھر، جنگل سنان،
اندھیر بیا بان، مرگھٹ میں دُور دُور تک راکھ کے ڈھیر جلے
ہوئے لکڑ پڑے، کہیں کہیں چٹائیں آگ چمکتی ہے، پھر وہ سنان
میدان، پتے ہوا سے کھڑکتے ہیں، ہوا کا سناٹا، پانی کا شور،
الوکی ہوک، وحشت کو دوبالا کرتے ہیں۔“

جب نظم اُردو کی تاریخ لکھتے ہیں تو اپنی انشا پر دازی کا وہ کمال
دکھاتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ جتنی مرتبہ پڑھو طبیعت چاہتی ہے
اتنی ہی مرتبہ پھر پڑھو۔ ہر وقت ایک نیا لطف آتا ہے۔ اس میں شاعر کی
فطرت کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :- اس کے خیالات سچ کے پابند نہیں
ہوتے۔ وہ اپنے مطلب کے موقع پر ہر بات موزوں کر لیتا ہے۔ اس کے
واقعات اصلیت کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ گویا شاعری میں سچ بولنا اپنے
وجدان کو متاثر کرنا ہے۔ مثلاً

”شاعر جب صبح کا نور ظہور دیکھتا ہے تو کبھی کہتا ہے دیک
مشرق سے دودھ ابلنے لگا۔ کبھی کہتا ہے دریا ئے سیما برج

مارنے لگا۔ کوئی مشرق سے کافور اڑاتا ہے، کبھی مرغانِ سحر کا
 غل اور عالمِ نوز کا جلوہ، شام کو شفق کی بہار دکھاتا ہے۔
 مغرب کے چھپر کھٹ میں آفتاب نے آرام کیا اور شکر فی چادر
 تان کر سو رہا، کبھی کہتا ہے جامِ فلکِ خون سے پھلک رہا ہے،
 نہیں مغرب کے دیوان میں آگ لگ گئی، تاروں بھری رات
 میں چاند کو دیکھ کر کہتا ہے دریائے نیل میں نور کا جہاز چلا جاتا ہے“
 صفحہ ۸۵ تک تاریخِ زبانِ اردو، ہندی اور فارسی انشا پردازی
 تاریخِ نظمِ اردو پر خوب عالمانہ و شاعرانہ بحث ہے۔

پہلے دور میں ولی اور ان کے قریب العصر با کمال جلسہ جمائے بیٹھے
 ہیں۔ دوسرے میں شاہِ حاتم، خاں آرزو، فضاں ہیں۔ تیسرے کی مغل
 کے سرگرم کار مرزا مظہر جان جاناں، میر سوز اور درد ہیں۔ میر تقی میر نے
 لاکھوں دردِ دل جمع کر کے غمِ عالم کی دیوار اٹھائی ہے۔ سودا کے قصیدوں کی
 اظہارِ شخصیت کا وہ عالم کہ پناہ بخدا۔ ان کے کلام کو جمع کر کے ایک دیوان
 قہقہہ بلند کی ہے۔

چوتھا دور مصحفی، انشا اور جبرائیل کے ہنگاموں سے معمور ہے۔
 پانچویں دور میں ناسخ، آتش، شاہ نصیر، مومن، ذوق، غالب، انیس و

دبیر کے دھواں دھار کلام اور محشر سامانیوں کی ہل چل ہے۔
 آتش کو بجائی شاعری کا بادشاہ بنایا ہے جس کے دھول دھبوں سے
 حقیقت کی لگیں دکھ رہی ہیں۔ نسخ کے یہاں بڑا بول ہے۔ دھوم دھام
 ہے۔ ہا وہو کی گرمی مازار ہے۔

(غرض آب حیات ایک گیتائے شعراء ہے۔ جس میں دنیائے شاعری
 کے درخندہ ستارے آد کے قلم سے جینے لگے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جس کا
 ذکر انھوں نے کر دیا ہے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ جاوید ہو گیا اور جس کا
 ذکر نہیں کیا ہے وہ حقیقت میں ان کے آب حیات سے محروم ہو گیا آزاد
 نے یہ ایک ایسا ابدی نغمہ اپنے پیچھے چھوڑا ہے کہ دنیائے ادب ان کے
 اس ادبی احسان کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی یہ ان کے بلند پایہ ادبیت کا
 ایک کھلا ثبوت ہے۔)

نیرنگ خیال | آب حیات کے بعد آزادی اہم تصنیف جو شاعرانہ
 خیال آرائیوں اور ادبی گل کاریوں کی وجہ سے ان کا دوسرا بڑا کا زنامہ ہے
 وہ ”نیرنگ خیال“ ہے۔

یہ دو حصوں میں مشتمل ہے تصنیف ہوئی۔ حصہ اول ۲۰ صفحہ کی
 کتاب ہے۔ اس میں دیباچہ ملا کر کل ۱۳ مضمون ہیں۔

دنیا کی دوسری زبانوں میں لٹریچر کی ایک صنف مائیتھالوجی ہے جس میں انسانی جذبات اور مذہبی معتقدات مشخص طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ فی زمانہ انسان کا تخیل اشکال و صورت کو بہت جلد گرفت کر لیتا ہے۔ مثلاً غصہ، رحم اور انصاف کو ان کے خصائص طبعی کی بناء پر ویسی ہی انسانی شکلوں میں ڈھالا جائے تو پڑھنے والا اس سے بہت جلد متاثر ہوتا جاتا ہے۔ انگریزوں میں اس طرز بیان کی ایک مشہور کتاب پل گرمس پروگرس (زائر کا سفر) کے نام سے موسوم ہے۔ جس میں مسیحی عقاید اور محاسن اخلاق کو محسوس صورتوں میں پیش کیا گیا ہے۔

”کہا جاتا ہے کہ انجیل کے بعد جس کتاب نے مسیحیت کے قبول کرنے کی سب سے زیادہ ترغیب لوگوں کے دلوں میں پیدا کی وہ وہی سفر نامہ ہے۔ اس کتاب کے مقبول عام ہونے کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کا ترجمہ اب تک دنیا کی تقریباً ۸۴ زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اس طرز بیان کو پیش نظر رکھ کر آزاد نے بھی ”نیرنگ خیال“ لکھی ہے۔ چنانچہ خود آزاد لکھتے ہیں ”یہ چند مضمون جو لکھے ہیں۔ نہیں کہہ سکتا کہ ترجمہ کیے ہیں۔ ہاں

جو کچھ کانوں سے سنا اور فکر مناسب نے زبان کے حوالے کیا۔ ہاتھوں
نے اسے لکھ دیا۔“

بالعموم یونانی اور رومی لوگوں کو اس قسم کی کتابوں کا بڑا شوق تھا۔
انگریزی میں ایڈلسن جان بنین اور اسپنسر کے ایلکیری (خیالی قصے) مشہور ہیں۔
فارسی میں مولنا روم اور انوار سہیلی سنسکرت میں ہتوا پدیش اور عربی میں انوار الصفا
وغیرہ۔ آزاد نے غالباً اپنے قصوں کی بنیاد یونانی قصوں پر رکھی ہے۔ اور
اس سے ان کی یونانی علم الاضام کی واقفیت کا بہت کچھ پتہ چلتا ہے۔ اس
کتاب میں انسان کے مختلف اوصاف و خصائل اس کے جذبات و خواہشات
مشخص طور پر دکھائے گئے ہیں۔

مؤلف تاریخ ادب اردو لکھتے ہیں :-
”وڈاکٹر لائٹنر نے ان کو اس کتاب کے لکھنے کی ترغیب
دی تھی۔ اور اس کا خاکہ تیار کر دیا تھا۔ مگر یہ بڑی قابل تعریف
بات ہے کہ مولنا آزاد یا وجود انگریزی کم جاننے کے اس اتباع میں
کامیاب ہوئے۔ یہ کتاب ان کے خاص طرز تحریر میں لکھی گئی ہے۔
مگر نفس مضمون سے زیادہ طرز بیان بہت دلچسپ ہے۔“
مولنا حاتمی اس کی نسبت رقم طراز ہیں۔

”آزاد کے قلم نے پہلے پہل جذبات انسانی کی تجسیم و شخص
کی اور مقولات کی تصویریں محسوسات کی شکلوں میں کھینچی ہیں۔ اور
خصائل انسانی کے فطری خواص ایسے مؤثر اور دلکش پیرایہ میں
بیان کیے ہیں۔ جن سے اردو لٹریچر اب تک خالی تھا۔“

مؤلف سیر المصنفین اپنے تذکرہ میں ارقام فرماتے ہیں۔
”نیز نگ خیال کی نشر ہزار نظموں پر فوقیت رکھتی ہے۔

زنگین بیانی کا ایک دل فریب مرقع ہے۔ اخلاقی اور تمدنی اصلاح
کا ایک پختہ کار دستور العمل، پند و نصائح کا ایک دفتر ہے! استعار
و تمثیل میں وہ وہ مطلب کی باتیں بتائے گئے ہیں کہ پڑھنے والا
شستہ خیالات سے مالا مال ہو جاتا ہے۔ اس کتاب نے اردو نثر
کی نئی طرز قائم کی۔ اگرچہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کتاب میں
زیادہ تر انگریزی روش کا پرتو ہے جس میں مضمون نویس کی جدید
طرز کا چہرہ اُتارا ہے۔“

اس میں مختلف مضامین ہیں۔ جن میں سے بعض کے یہ عنوان ہیں۔ سیر زندگی،
انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا۔ شہرت عام اور بقلے دوام کا دربار،
گلشن امید کی بہار وغیرہ اور سب سے آخر ایک نظم ہے موسومہ بد نشام کی آمد

اور رات کی کیفیت“

سیر زندگی میں سارا فلسفہ بھر دیا ہے۔ زندگی کی سیر اس آن بان سے شروع کی ہے۔

”ایک حکیم کا قول ہے کہ زندگی ایک میلہ ہے اور اس عالم میں جو رنگا رنگ کی حالتیں ہم پر گذرتی ہیں یہی اس کے تماشے ہیں۔ لڑکپن کے عالم کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھے تو جوان ہوئے اور پھر پختہ سال انسان ہوئے۔ اس سے بڑھ کر بڑھا پا دیکھا۔

اور حق پوچھو تو تمام عمر انسانی کا عطر وہی ہے“

پھر اس عمر انسانی کے عطر پر ایک نوٹ لکھا ہے جس کی تشریح میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھردی ہے۔ ان کی سیر زندگی کتاب کے ۹ صفحوں پر چھائی ہوئی ہے۔ جو صرف پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

اسی طرح ”انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا“ ایک قیامت کا مضمون ہے۔ اس میں اس فلسفہ کو نبھایا ہے کہ ”اگر ہم اپنی اپنی مصیبتوں کو آپس میں بدل بھی سکتے تو پھر ہر شخص اپنی پہلی ہی مصیبت کو اچھا سمجھتا“ اور یہ امر واقعہ ہے۔

ایک موقع پر آزاد کو سوچتے سوچتے اور فلسفہ کے کسی پہلو پر غور کرتے کرتے

نیند کا غلبہ ہو جاتا ہے وہ سو جاتے ہیں اور جو خواب کہ وہ دیکھتے ہیں اس کو مضمون کی شکل میں قلم بند کرتے ہیں۔

شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار ایک دوسرا ہی رنگ لیے ہوئے ہے۔ فرماتے ہیں۔

”بقائے دوام دو طرح کی ہے کہ ایک تو وہی جس طرح روح فی الحقیقت بعد مرنے کے رو جائے گی اس کے لیے فنا نہیں۔ دوسرے وہ عالم یادگار کی بقا جس کی بدولت لوگ نام کی عمر سے جیتے ہیں اور شہرت دوام کی عمر پاتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ اچھے سے اچھے اور بڑے سے بڑے کام جن جن سے ہوئے یا تو ثواب آخرت کے لیے۔ یا دنیا کی ناموری اور شہرت کے لیے ہوئے“

پھر اس مضمون کو تشبیہوں اور استعاروں سے خوب مرصع کیا ہے۔ مثلاً شاہان مغلیہ کا ذکر ہے۔ ان کو ایک مخصوص پیرایہ میں لکھا ہے۔ سعدی اور ابو الفضل کا ذکر۔ ہندوستانی باکمال شعراء کا بھی کچھ تذکرہ ہے جو اس مضمون کا پنجوڑ ہے۔ جیسے

”دیکھنا کیا ہوں ایک غول ہندوستانی شعراء کا آ رہا ہے۔ ان میں ایک شخص جو بات کرتا ہے منہ سے پھول جھڑتے

ہیں۔ لوگ ساتھ ساتھ دامن پھیلائے تھے۔ مگر بعض پھولوں میں
کانٹے ایسے ہوتے تھے کہ لوگوں کے کپڑے پھٹ جاتے تھے۔ پھر
بھی مشتاق زمین پر گرنے نہ دیتے تھے۔ کوئی نہ کوئی اٹھالیتا تھا۔
وہ مرزا رفیع سودا تھے۔

میر بد دماغی اور بے پروائی سے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتے تھے
شعر پڑھتے تھے اور منہ پھیر لیتے تھے۔ درد کی آواز دردناک
دنیا کی بے بقائی سے جی بیزا کیے دیتی تھی۔ میر حسن اپنی
سحر بیانی سے پرستان کی تصویر کھینچتے تھے۔ انشا قدم قدم پر
نیا بہروپ دکھاتے تھے۔ جرات کو اگرچہ کوئی خاطر میں نہ لاتا
تھا۔ مگر جب وہ میٹھی آواز سے ایک تان اڑاتا تھا تو سب کے
سر ہل جاتے تھے۔

ناتخ کی گل کاری چشم آشنا معلوم ہوتی تھی مگر آتش کی
آتش بیانی اسے جلائے بغیر نہ چھوڑتی تھی۔ مومن کم سخن تھے۔
مگر جب کچھ کہتے تھے جرات کی طرف دیکھتے جاتے تھے۔ ذوق
کے آنے پر پسندام کے عطر سے دربار ہلک گیا۔ انھوں نے
اندر اگر شاگردانہ طور پر سب کو سلام کیا۔ سودا نے اٹھ کر

ملک الشعراء کا تاج ان کے سر پر رکھ دیا۔ غالب اگرچہ سب سے نیچے تھے پر کسی سے نیچے نہ تھے۔ بڑی دھوم دھام سے آئے اور ایک نقارہ اس زور سے بجایا کہ سب کے کان گنگ کر دیے۔ کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا مگر سب واہ واہ اور سبحان اللہ کرتے رہ گئے۔

یہ سب عالم رویا کا فسانہ ہے۔ اس انداز بیان میں اتنی رنگینی اور جدت ہے کہ آج انکراہل قلم آزاد کے اس رنگ کو اڑانے کی سعی کر کر رہ جاتے ہیں مگر تحصیل حاصل۔ کیونکہ آزاد کا رنگ آزاد ہی کا حصہ ہے۔ ”علوم کی بد نصیبی“

بھی ایک معلومات کا دفتر۔ صنائع لفظی کا گلدستہ ہے۔ یہ نثری شہ کار مصر
پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

یوں تو نیرنگ خیال کی عبارت دیکھنے میں ایک خیالی تصویر معلوم ہوتی ہے۔ مگر دور اندیشی کی آنکھ سے دیکھنے والا سمجھ سکتا ہے کہ زمانہ اور اہل زمانہ کو جس قسم کے لٹریچر کی ضرورت ہے اس کی جا بجا اس میں جھلک نظر آتی ہے۔ مثلاً مغربی زبان کے مضمون کو زبان اردو میں ڈھال کر شعرا اور اہل قلم کو ہدایتیں ہیں کہ مشرقی زبان اردو کے مالک بن کر مغربی خزانوں پر بھی متصرف ہوں۔ اس طرح ان دونوں زبانوں کے تجربے سے ایک ایسا سمویا ہوا دریا بہائیں جس سے ملک سیراب ہو جائے اور

زبان کا خزانہ مالا مال ہو جائے۔ ان تمام مطالب کو آزادانہ نظم کے بدلے
نثر کا لباس پہنا کر اس طرح پیش کیا ہے کہ نیزنگ خیال کا تخیل اور اس کی
نثر نظم کی سرحد کو ٹکراتی ہوئی آگے نکل گئی ہے۔ آخر میں کیفی صاحب کی
اس وقیع و گراں قدر رائے پر اس کا ذکر ختم کر دیا جاتا ہے۔ آپ مشورات میں
لکھتے ہیں۔

”نثر کی وقیع تصنیف جو بلا تخصیص اپنی ہو سکتی ہے آزاد کا
نیزنگ خیال ہے۔ یہ کتاب فی الواقع اسم با سمنی ہے۔ یہ نثر ہزار
نظم کی کتابوں پر فوقیت رکھتی ہے رنگین بیانی کا ایک دل فریب
مرقع ہے۔ اخلاقی اور تمدنی اصلاح کا ایک نچتہ کار و دستور العمل،
پند و نصائح کا ایک بہتا ہوا سیلاب ہے“

اس کا ہر مضمون اپنی نیزنگی میں عہر گلے رازنگ و بوئے دیگر است کا
مصدق ہے چنانچہ الگ الگ ایک ایک مضمون کا تجزیہ کرنا دریا کو کوزہ میں بند
کرنے سے کچھ کم نہیں۔

- (۱) ”سیر زندگی“ کا مضمون ڈاکٹر جانسن کے و اچ آف لائف
کا خلاصہ ہے۔
(۲) ”شہرت عام و بقائے دوام“ میں گولڈسمتھ کے فہم کوچ
سے خیالات لیے ہیں۔ اس طرح آرزو ادب میں پرایا ادب ضم کر کے
اپنے ادب کو مالا مال کر دیا ہے۔

نیزنگ خیال حصہ دوم | یہ ۱۲ صفحہ کی ایک تصنیف ہے۔ ان کی خیالی انشا پردازی اور صنائعِ لفظی کا ایک بیش بہا مرقع ہے۔ دیباچہ آغا محمد طاہر نے لکھا ہے۔ شاید دوبارہ چھپی ہے۔ دیباچہ میں ۲۳ جنوری ۱۹۲۳ء اس کی تاریخ ہے۔ تمہید سے آزاد کا رنگ شروع ہوا ہے۔ اس کی کل کا میناست چھ مضامین ہیں :-

جنت الحمقا، خوش طبعی، نکتہ چینی۔ مرقع خوش بیانی، سیر عدم، بقائے دوام سب مضامین میں انسانی خصال کو مشخص کیا گیا ہے۔

جنت الحمقائیں وہی خواب کی باتیں ہیں مثلاً یہ کہ

”سوتے سوتے ایسا معلوم ہوا گویا کسی نے مجھے ایک پہاڑ پر پھینک دیا ہے۔ مگر عجیب پہاڑ ہے کہ جس کے چاروں طرف ہنر ہلہاٹا ہے“

ان سبزہ زاروں میں سے بھٹکتے ہوئے پہاڑ کی چوٹی پر پہنچتے ہیں وہاں سے دیکھتے ہیں کہ دور ایک چشمہ ہے اس میں ایک شہزادی پاؤں لٹکائے بیٹھی ہے کہ زیور اور لباس سے طاؤس مرصع کا عالم ہے۔ مگر آنکھ سے بھینگی ہے اور یہ ملکہ غلط فہمی ہے۔ اسی کے برابر ایک دوسری عجوبہ روزگار شکل نظر آتی جس کے بے انتہا سر ہیں اور دھڑا ایک، جس بات کی پسند ناپسند پر سر ہلاتی ہے

تمام جہان کے سراسی طرح ہل جاتے ہیں۔ اس کا نام پسند عام ہے۔ یہ دونوں ساتھ رہتی ہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتنی گہری باتیں ہیں۔ پھر خوشامد، خام خیالی، پدرم سلطان بود کا گھنڈ، نا انصافی، رسوائی، خود پرستی پر خامہ آرائی کی ہے۔ زندگی کو ایک اندھیری کوٹھری سے تشبیہ دی ہے۔ مراد اس قید سے قید حیات ہے جس کا نقشہ اور جس کی مثال یوں دی ہے۔

”جن مکانوں میں یہ لوگ ڈال دیے گئے ہیں۔ ان کی خرابی

دیکھنی چاہو تو دل ہائے پریشان کی بد حالی دیکھو۔“

چنانچہ انہیں رنگینوں کا سرمایہ لیے ہوئے یہ مضمون صفحہ ۳۱ پر ختم ہو جاتا ہے۔ اور ”خوش طبعی“ پر خوش الحانیاں شروع کر دی ہیں ”خوش طبعی کی تعریف میں یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ وہ کیا شے ہے۔

البتہ یہ کہنا آسان ہے کہ وہ کیا شے نہیں ہے۔ اور اس کا نسب نامہ لکھ دیا ہے مثلاً سچ، خوش طبعی، حسن بیان، حسن ادب، خندہ جبینی اس کے خاندانی ممبر ہیں۔ اب اس کو ایک قصہ کے پیرایہ میں سلجھایا ہے۔ اور بات میں بات پیدا کی ہے۔ یہ خاندانی بحث صفحہ ۳ پر ختم کر دی ہے۔

”نکتہ چین“ کے عنوان سے دوسرا مضمون شروع کیا ہے اور لکھا ہے کہ کسی نکتہ چین نا انصاف کی بدولت تصنیف کا کیا حال ہوتا ہے۔ ایک مصنف

لوگ کیسے کیسے آوازے کستے ہیں۔ اور یہ غریب نہ ان سے کسی شے کا طالب ہے نہ ان کے کسی کام میں مایاج ہے۔ بات اتنی ہے کہ اپنی یا اپنے کلام کی شہرت چاہتا ہے۔ اس کے لیے کتنی مصیبتیں اٹھاتا ہے۔ اپنے آرام کا خون کرتا ہے چراغوں کے دوھیں کھاتا ہے۔ نیند حرام کر لیتا ہے۔ دماغ کا عرق پیشانی سے ٹپکاتا ہے۔ اکثر نتیجہ ناکامی ہی ہوتا ہے۔ فائدہ کچھ بھی نہیں۔ قدر کسی کو نہیں۔ مگر یہ اپنے شوق کو پورا کرتا ہے۔ اور اپنے علم کو عمل سے دو چار کر کے ایک طرح قوم کی خدمت کرتا ہے۔ مگر وہی قوم اس کا مذاق اڑاتی ہے۔ اصل مفہوم تو خبط ہو جاتا ہے۔ کہتے کیا ہیں کہ بس نام کی خاطر یہ کام کیا۔ اس کی تصنیف میں وہ وہ کیڑے ڈالتے ہیں کہ پھر اس غریب کی ہمت نہیں ہوتی کہ کچھ لکھے اس پر کیا اچھی تشبیہ دی ہے۔

”کالا ناگ راگ سے پر ج جاتا ہے۔ اور بھونکتا کتا بھی

ہڈی سے چپ ہو جاتا ہے۔ آج کل کے نکتہ چین اگرچہ سانپ

جتنے دانت بھی نہیں رکھتے مگر اس سے بھی سوا زہر اگلے ہیں۔

اور کتے کے برابر بھی نہیں کاٹ سکتے۔ مگر بھونکنے میں اس سے

بھی کئی میدان پر سے نکل جاتے ہیں۔“

اس تنہید کے بعد نکتہ چینی کو مشخص کرتے ہوئے اس کو خواجہ حق پرست

اور محنت خاتون کی میٹی بنایا ہے۔ جس کو پیدا ہوتے ہی انصاف کے سپرد کر دیا گیا۔ علم و دانش کے محلوں میں پروان چڑھی۔ اس کے بائیں ہاتھ میں ایک مشعل بھی تھی کہ اس کی روشنی کبھی نہ بجھتی تھی اس مشعل کو خود محنت خاتون نے بنایا تھا۔ اور حق پرست نے روشن کیا تھا۔ بڑا جوہر اس میں یہ تھا کہ چیز کیسی ہی مخفی ہو۔ اس کی روشنی سارے کا سارا حال جوں کا توں آئینہ کر دیتی تھی۔ ظاہر آرائی اور غلط نمائی کے بیچوں میں اس کی شعاع سوئی کی طرح بیٹھ جاتی تھی۔ غرض وہ نکتہ جہینی جو اصلاح کے لیے کی جاتی ہے اس پر ان استعاروں میں اس مضمون کو ختم کیا ہے۔ ۱۵ صفحہ پر یہ قصہ ختم ہو گیا۔

اور دوسرے صفحہ سے ”مرقع خوش بیانی“ کا دفتر کھل گیا۔ اس میں بھی وہی خواب ہے۔ عالم رویا کی سرزمین ہے۔ دشت و جبل کا منظر ہے شہر ہے باغ ہے کھیت ہیں جنگل ہے۔ مگر کسی چیز میں اصلیت کا رنگ نہیں۔ یہ سارا طلسم دروغ کی کائنات کا عکس ہے۔ ان مصنوعی چیزوں پر جب سچائی اپنا پر توڑا لیتی ہے تو ساری قلمی کھل جاتی ہے۔ سچ کی روشنی میں یہ جھکتی ہوئی چیزیں ایسی غائب ہو جاتی ہیں جس طرح سورج نکلتے ہی تاروں کی جھل ملاہٹ مدم پڑی جاتی ہے اور پھر اس کی روشن کرنیں ان کی سباط پر پورا پورا قبضہ کر لیتی ہیں۔ دروغ کے بھوت ان پریوں کے سایہ میں ماند

پڑ کر بالکل غائب ہو جاتے ہیں۔ پس یہ قصہ ۶۵ صفحہ پر ختم اور اب ”سیرِ عدم“ کو نکلتے ہیں پسماندوں کو چھوڑ کر عدم کی سیر ایک جبرت و الم کی داستان ہے۔ اس میں ان بد نصیبوں کا کچا چٹھا ہے جو مرنے والوں کے پیچھے رونے کو رہ جاتے ہیں۔ جان صحرائے تصور میں ان کے پیچھے کیسی بھٹکتی پھرتی ہے۔

مگر جب تھک جاتی ہے تو مایوس اور اداس منہ پیٹے پڑی رہتی ہے۔ لکھتے ہیں۔
 ”عقل و فہم دل نگین کو سہارا دے سکتے ہیں مگر دل ایسا

بھولا بھالا شخص ہے کہ ذرا نہیں سمجھتا۔ اور جو غذا اس جی کو
 بھاتی ہے اس کو دھونڈتا ہے۔ درحقیقت یاد جو دل کی

ہمسائی ہے وہ ہمیشہ غم کو خانہ دل میں بلاتی ہے۔“

غرض ایسی ایسی باتیں یاد آتی ہیں جن سے دل بھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے مگر امتداد زمانہ بتدریج ان صدمات کو کم کر دیتا ہے۔ وقت اپنے ساتھ عقل و فہم کی فوج لاتا ہے اور حسرت و اشتیاق کے جذبات کو اپنی ممکنہ حد تک دبانے کی کوشش کرتا ہے۔ یا پھر کوئی دوسرا ہی شوق غالب آ جاتا ہے۔ اور ان کی شدت میں کمی آ جاتی ہے۔ یہاں تک لکھنے کے بعد پھر آزاد پر نیند کا دیوتا اپنے افسوں کے زور سے نازل ہو جاتا ہے۔ اب پھر وہی قصہ کا رنگ ہے۔ خواب کی دنیا ہے۔ نیرنگ خیال کیا ہے

آزاد کے خیالی جلسے میں جن میں تخیل ہی تخیل کی حکومت ہے۔ خیالات کا بہاؤ انھیں کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے اور قصہ کے اندر قصہ پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح یہ داستان ۷۷ صفحہ پر ختم ہو گئی ہے۔ اور بقائے دوام کا قلم طاہر صاحب کے ہاتھ آیا ہے۔ ۱۱۲ صفحات تک انھوں نے فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیے ہیں۔ ان کے اس مضمون میں آزاد کے شہرت عام و بقائے دوام کی جھلک ہے۔ انھوں نے اسی پہنچ پر اس کو لکھنے کی کوشش کی ہے۔

پس نیز نگ خیال کی خیالی دنیا بقائے دوام پر ختم ہو گئی ہے۔ مگر یہ دنیا محض خیالی نہیں اس میں بڑے بڑے زندگی کے راز ”خیال“ کا بھیس بدلے بیٹھے ہیں۔ جن کو سمجھنے کے لیے اتنا ہی مبلغ عقل و علم درکار ہے۔ دربار اکبری آزاد مرحوم کی تاریخی تصانیف میں دربار اکبری سب سے مشہور کتاب ہے۔ یہ کچھ اوپر ۷۰ صفحہ کی ضخیم تصنیف مختلف عنوانات پر مشتمل ہے۔ اپنی عبارت کی رنگینی و دلاویزی کے اعتبار سے بھی یہ ان کی تیسری بہترین تصنیف ہے۔ تاریخ جسے خنک و بے کیف مضمون میں بھی آزاد کا رنگ نمایاں ہے۔

اس میں جلال الدین اکبر شہنشاہ ہندوستان اور اس کے امراء

جلیل القدر کے دلچسپ حالات درج ہیں۔ اکبر اور اس کی زندگی کا ہر چھوٹا
 بڑا کارنامہ۔ اس کی مہات، تفریحی مشاغل، مصالح مملکت، اس کے
 عہد کی قصائیف، عمارات، غرض اکبر کے متعلق ہر چھوٹی موٹی بات شاعرانہ
 چادونگاری سے آراستہ کر کے قلم بند کی ہے۔ اصل میں یہ کتاب اس عہد کے
 ہندوستان کی ایک ایسی دلکش اور جامع تاریخ ہے جس میں عام فہم محاورات کے
 دریا بہا دیے ہیں۔ جو مورخانہ شان کے ساتھ اردو ادب کا بہترین ادبی کارنامہ
 کہلایا جاسکتا ہے۔ اردو زبان میں اکبری عہد حکومت کے واقعات اس قدر
 تفصیل کے ساتھ ایک جگہ ملنے مشکل ہیں۔ جہاں تک وقائع نگاری کا تعلق
 ہے یہ ان تمام واقعات کا احاطہ کیے ہوئے ہے جن کا تعلق اکبر اور ہندوستان
 سے ہے۔ اگر کوئی صحیح معنوں میں تاریخ ہند کی اس جلیل القدر مہستی کی زندگی
 کے حالات سن و سن جاننا چاہتا ہے تو وہ صرف دربار اکبری پڑھ لے۔ اور
 پھر آزاد کا انداز بیان، جس صفحہ کو کھولے۔

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا این جاست

اگرچہ یہ کتاب وہ خود ترتیب و نظر ثانی کے بعد نہ چھپوا سکے۔ اس کی
 نسبت اپنے قلمی خط میں لکھا ہے :-

دردبار اکبری ۷۔ ۸ سو صفحہ کی کتاب میں نے لکھی ہے۔

اس میں امراءِ عہد اکبر کے حالات اسی لطف کے ساتھ بیان ہوئے ہیں جس طرح میر، سودا سید انشا کے حالات آپ نے آبِ حیات میں دیکھے۔ کتاب تیار ہے۔ فقط نظر ثانی کی کسر ہے

مورخہ ۵ جون ۱۸۷۶ء

مؤلف خجاندہ جاوید رقم طراز ہیں۔

”ان کی ایک پُرانی تالیف موسوم بہ دربار اکبری جسے خود ترتیب دے کے نہ چھپوا سکے حال میں شائع ہوئی ہے۔ مگر اس صورت میں بھی یہ کتاب عبارت کی رنگینی کے اعتبار سے ان کی بہترین تصنیفات میں ہے“

مؤلف تاریخ ادب اردو لکھتے ہیں۔

”یہ مہتمم بالشان تصنیف اکبر کے عہد اور ان کے اراکین سلطنت کے حال میں ہے اس کتاب کی عبارت اپنے رنگ میں لاجواب ہے۔ افسوس ہے کہ اس پر نظر ثانی نہ ہو سکی۔ اس کتاب میں عہد اکبر کی جتنی جاگتی تصویریں دکھائی گئی ہیں“

طالب الہ آبادی نے یہ تحقیق کی ہے۔

”یہ کتاب ۱۸۹۸ء میں مطبع رفاہ عام کے مالک و ناظم منشی سید ممتاز علی نے چھپوائی ہے۔ اس وقت اس کی ضخامت صرف ۱۲۸ صفحات کی تھی۔ دوسری مرتبہ محمد ابراہیم صاحب (فرزند آزاد مرحوم) نے ۱۹۱۰ء میں اصل مسودہ کی مدد سے شایع کی۔ جس کا حجم اک بارگی ۱۲۸ سے ۸۴۰ صفحات کا ہو گیا۔“
مؤلف سیر المصنفین لکھتے ہیں۔

”دربار اکبری کی عبارت دیکھ کر انگریزی تعلیم یافتہ صحابہ کو ضرور لارڈ مکالے کی تاریخ نویسی یاد آجاتی ہے۔ جو لطف انگریزی میں لارڈ موصوف کی تحریر سے پیدا ہوتا ہے بعینہ آزاد کی تحریر اردو میں دل پر وہی اثر کرتی ہے اور جس طرح مکالے کی تاریخ انگلستان ناقابل اعتماد ہے بعینہ یہی حال ایک حد تک دربار اکبری کا ہے۔ کیونکہ آزاد نے اپنی آراء اور اپنے جذبات کو ہر جگہ نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ امر اصول فن تاریخ نویسی کے بالکل خلاف ہے۔ اگرچہ اکثر مؤرخ اسی دام میں پھنس جاتے ہیں“

اب اپنی تصنیف کی نسبت خود مصنف کا خیال دیکھیے :-
 وہ لوگ کہیں گے کہ آزاد نے دربار اکبری لکھنے کا وعدہ
 کیا اور شاہنامہ لکھنے لگا۔ لو اب ایسی باتیں لکھتا ہوں کہ
 جس سے شہنشاہ موصوف کے مذہب، اخلاق، عادات،
 سلطنت کے دستور و آداب اور اس کے عہد کے رسم و رواج
 اور کاروبار کے آئین آئینہ ہوں۔“

اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ دربار اکبری میں اکبر کے
 خصائل و عادات بیان کرنے میں آزاد نے اپنے پورے زورِ قلم اور قوتِ
 بیان سے کام لیا ہے۔ جس کی نظیر ان کی تمام تصانیف میں دوسری جگہ
 مشکل سے مل سکتی ہے۔ لکھتے ہیں :-

”اس کی طبیعت کا رنگ ہر عہد میں بدلتا رہا۔ بچپن کی
 عمر کہ پڑھنے کا وقت تھا۔ کبوتروں میں اڑایا۔ ذرا ہوش
 آیا تو کتے دوڑانے لگے۔ اور بڑے ہوئے گھوڑے بھگوانے اور
 باز اڑانے لگے۔ نوجوانی تاج شایانہ لے کر آئی۔ بیرم خاں
 وزیر صاحب تدبیر مل گیا تھا۔ یہ سیر و شکار اور شراب و کباب
 کے مزے لینے لگے۔ لیکن ہر حال میں مذہبی اعتقاد سے دل

نورانی تھا۔ بزرگانِ دین سے اعتقاد رکھتا تھا۔ نیک نیتی اور خدا ترسی بچپن سے مصاحب تھی۔ طلوعِ جوانی میں آکر کچھ عرصہ تک ایسے پرہیزگار نماز گزار ہوئے کہ کبھی کبھی خود مسجد میں جھاڑو دیتے تھے۔ اور نماز کے لیے آپ اذان کہتے تھے۔ علم سے بے بہرہ رہے مگر مطالبِ علمی کی تحقیقات اور اہل علم کی صحبت کا شوق اتنا تھا کہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ باوجودیکہ ہمیشہ فوج کشی اور مہموں میں گرفتار تھا اور انتظامی کاروبار کا ہجوم تھا۔ سواری شکاری بھی برابر جاری تھی مگر وہ علم کا عاشق، علم و حکمت کے مباحثوں اور کتابوں کے سننے کا وقت نکال ہی لیتا تھا۔ یہ شوق کسی خاص مذہب یا خاص فن میں مجبوس نہ تھا۔ کل علوم اور کل فنون اس کے لیے یکساں تھے۔ ۲۰ برس تک دیوانی، فوجداری بلکہ سلطنت کے مقدمات بھی علمائے شریعت کے ہاتھ میں رہے۔ جب دیکھا کہ ان کی بے لیاقتی اور جاہلانہ سینہ زوری ترقی سلطنت میں خلل انداز ہے تو آپ کو سنبھالا۔ اس عالم میں جو کچھ کرنا تھا امراءے تجربہ کار اور معاملہ فہم عالموں کی صلاح سے

کرتا تھا۔ جب کوئی ہم پیش آتی یا اشلے ہم میں کوئی نئی صورت
واقع ہوتی یا کوئی انتظامی امر آئین سلطنت میں جاری یا ترمیم
ہوتا تو پہلے امراء دولت کو جمع کرتا۔ ہر شخص کی رائے کو بے رک
سننا اور سناتا اور اتفاق رائے، صلاح و اصلاح کے ساتھ عمل کرتا
کرتا۔“ (دربار اکبری)

شیخ ابو الفضل کے مرنے پر کیسی اچھی بات لکھی ہے جو بذات خود ایک
ضرب المثل ہے۔

”۵۲ برس چند مہینے کا سن، مرنے کے دن نہ تھے۔

مگر موت نہ دن دیکھتی ہے نہ رات، جب آجائے وہ ہی اس کا
وقت“

عبدالرحیم خانخاناں حاتم ثانی کے ذکر میں بلاغت و فصاحت کی
جھلکیاں بھردی ہیں۔ لطائف و طرائف سے ان کے ذکر کو خوب سجایا ہے۔
مثلاً شیر شاہ کے متعلق ایک لطیفہ ہے جس میں اپنے انداز بیان کا سحر
جگایا ہے۔ لطیفہ

”شیر شاہ نے ترقی کی منزلیں طے کرنے میں اتنا عرصہ

کھینچا کہ تاج شاہی سر تک آتے آتے خود بڑھاپا آگیا بادشاہ

ہوا تو سرسفید، ڈاڑھی بگلا، منہ پر جھریاں، آنکھیں عینک
کی محتاج، جب لباس پہنتا اور زیور بادشاہی سجاتا تو آئینہ
سامنے دھرا ہوتا تھا۔ کہتا تھا، عید تو ہوئی مگر شام ہوتے ہوئے“
گویا ذوق کے اس شعر

”دیکھا دم نزع دلا رام کو عید ہوئی ذوق ولے شام کو“
کی تشریح آزاد مرحوم نے اپنے اس لطیفہ میں کر دی۔

خان خانان ہی کے ذکر میں زبان کی چاشنیاں جب رواں ہو جاتی
ہیں تو اپنی روانی میں خوب ہی چل نکلتی ہیں اور اس طرح ختم ہوتی ہیں۔
”استغفر اللہ کدھر تھا اور کدھر آن پڑا۔ مگر باتوں
کے مصالح بغیر تاریخی حالات کا بھی مزہ نہیں آتا۔“

خان خانان کے جوان بیٹے ایرج کے مرنے پر ایک فلسفیانہ عبارت
لکھی ہے اس روا روی میں دولت پر بھی بحث کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ
”سب سے بڑی دولت تندرستی ہے۔ اولاد بھی ایک
دولت ہے، علم و کمال، حکومت، امارت، زر و مال غرض
یہ سب دولت کے ضمن میں آجاتے ہیں۔“

خان خانان کے دو بیٹوں کے یکے بعد دیگرے مرنے پر آزاد نے ایک لطیفہ

ایسا بر محل لکھا ہے کہ اس کا ذکر کرنا غالباً بے محل نہ ہوگا۔ لطیفہ
 ”ایک شاعر کے پاس کوئی شخص آیا اور آبدیدہ ہو کر کہا کہ
 حضرت بیٹا مر گیا۔ تاریخ لکھ دیجیے۔ روشن دماغ شاعر نے اسی وقت
 سوچ کر کہا، داغ جگر۔

دوسرے برس وہی جگر کباب پھر آیا کہ حضرت تاریخ
 لکھ دیجیے، شاعر نے کہا چند روز ہوئے تم تاریخ لکھو اگر لے گئے
 تھے۔ اس نے کہا حضرت ایک اور تھا وہ بھی مر گیا۔ شاعر نے
 کہا اچھا، داغ دگر۔

جہانگیر نے ان دونوں واقعوں کو اپنی توزک میں لکھا
 ہے۔ حرف حرف سے در دیکھتا ہے“

ہم کاغذوں کے دیکھنے والے سہم جاتے ہیں تو ان رشتہ داروں کا کیا
 حال ہو گا جن کے صرف خیال سے تکلیف ہوتی ہے۔

میاں فہیم کا ذکر بڑے مزے سے کیا ہے۔ وہی میاں فہیم جن کے
 نام سے ہندوستان کے بچہ بچہ کی زبان پر یہ کہاوت مشہور ہے کہ ”کمائیں
 خان خانان اور ٹائیں میاں فہیم“ پھر خان خانان کی امارت اور دریائوں
 کے کارنامے قلم بند کیے ہیں۔ یوں تو کئی لطیفے ہیں لیکن یہ دو درخور بحث

معلوم ہوتے ہیں۔ جن میں دریا دلی اور فیاضی کے ساتھ قیافہ شناسی اور رموز آگاہی کے پہلو بھی نمایاں ہیں۔ مثلاً ایک دن خان خانان کی سواری چلی جاتی تھی ایک شکستہ حال غریب نے ایک شیشی میں بوند پانی ڈال کر دکھایا اور اسے جھکایا۔ جب پانی کرنے کو ہوا تو شیشی کو سیدھا کر دیا اس کی صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ شریف اور خاندانی ہے۔ خان خانان اسے ساتھ لے آئے اور انعام و اکرام دے کر رخصت کیا۔ لوگوں نے جب اس بے سرق داد و دہش کی وجہ دریافت کی تو کہہ دیا۔ تم نہیں سمجھ اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک بوند آبرو رہی ہے اور یہ بھی اب گرا ہی چاہتی ہے اسی طرح ایک دن خان خانان کی سواری چلی جاتی تھی۔ کسی راہ چلتے نے ایک ڈھیلا کھینچ مارا۔ سپاہی دوڑے دوڑے گئے اور اس کو پکڑ لائے انھوں نے کہا، ہزار روپیہ دے دو۔ سب حیران کہ یا الہی یہ ماجرا کیا ہے اور عرض کی ”جو نالایق قابل دشنام بھی نہ ہو، اسے انعام دینا آپ ہی کا کام ہے“ جواب دیا کہ ”لوگ بھل دار درخت پر ہی پتھر مارتے ہیں جو میرا بھل ہے وہ مجھے دینا واجب ہے“

ان کے بعد مسیح الدین حکیم ابو الفتح گیلانی کا ذکر خیر ہے پھر حکیم ہام جن کا اصلی نام ہمایون تھا۔ لیکن اکبر نے ہام کہہ کر بلایا۔ ان کا تذکرہ ہے،

اور پھر متواتر حکماء و فضلاء کا جا بجا ذکر آیا ہے، سلسلہ کلام میں یہ فقرے بڑے برجستہ ہیں :-

”یہ خلاصہ روزگار ابو الفضل، فیضی، حکیم ابو الفتح، حکیم ہمام تھے اور ہیر برکات تو کیا کہنا ہے، وہ تو بادشاہ کی دل لگی بلکہ زندگی کا کھلونہ تھا۔ ٹوڈرل نے کارگزاری و مزاج شناسی سے دل میں گھر کر لیا تھا۔ عبدالرحیم خان خانان پہلے انھیں چاروں میں پانچویں سوار تھے اور مان سنگھ چھٹے، پھر مہاتملکی کے ہیر بھیر میں آکر دور جا پڑے۔ کوکل تاش خاں دودھ کے زور سے ہر مقام پر جگہ لیتے تھے اور اکبر بھی چاہتا تھا کہ یہ ویسے ہی ہوں“

فیضی اور ابو الفضل کے سلسلہ میں مذہب پر کتنی سنجیدہ اور معقول بحث کی ہے، خیالات کیا ہیں مصنف کے ضمیر کا آئینہ ہیں جن سے ان کے کیر کڑ کا زبردست ثبوت ملتا ہے :-

”مذہب کے معاملہ میں ایک میرا خیال ہے۔ خدا جانے احباب کو پسند آئے نہ آئے، ذرا خیال کر کے دیکھو، اسلام ایک خدا ایک پیغمبر ایک، سنی شیعہ کا اختلاف ایک، منصب خلافت ایک

ہے جس واقعہ کو آج ۱۳ سو برس گزر چکے ہیں اس کو از سر نو دہرا کر اس قدر طول دینا کہ قوم میں ایک فساد عظیم کھڑا ہو جائے۔ چار آدمی بیٹھے ہوں تو صحبت کا مزہ جاتا رہے۔ کام چلتے چلے تو بند ہو جائیں۔ دوستی ہو تو دشمنی سے بدل جائے۔ قوم کی اتحادی طاقت ٹوٹ کر چند در چند نقصان لگے پڑ جائیں۔ ہم کتنے کم فہم ہیں جہاں مذہب کا نام آیا کہ آپس سے باہر ہو گئے۔ اس طرح اسلام کے اقبال کو کتنا صدمہ پہنچتا ہے۔ بھلا دنیا کے معاملات میں مذہب کا کیا کام ہم سب ایک ہی منزل مقصود کے مسافر ہیں۔ اتفاقاً گذرگاہ دنیا میں یک جا ہو گئے ہیں۔ راستہ کا ساتھ ہے۔ بنا بنایا کاروان چلا جاتا ہے۔ ہمدردی سے کام لیتے چلو گے تو ہنستے کھیلنے رستہ کٹ جائیگا۔ مذہب کے معاملات انگریزوں نے خوب قاعدہ رکھا ہے۔ ان میں بھی دو فرقہ ہیں اور ان میں سخت مخالفت ہے۔ پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک دو دوست بلکہ دو بھائی بلکہ کبھی میاں بیوی کے مذہب بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ وہ ایک گھر میں رہتے ہیں۔ ایک میز پر کھانا کھاتے ہیں۔ ہنسنا بولنا رہنا سہنا سب ایک جگہ مذہب کا

ذکر بھی نہیں۔ اتوار کو اپنی اپنی کتابیں اٹھائیں ایک ہی جگہ میں
 سوار ہوئے اور چلے، ایک کا گرجا راستہ میں آیا وہاں اتر پڑا۔
 دوسرا جگہ میں بیٹھا اپنے گرجا کو چلا گیا، پھر آئے۔ ایک جگہ بیٹھے
 وہی ہنسنا بولنا، کاروبار، اس کا ذکر بھی نہیں کہ تم کہاں گئے
 تھے اور وہاں کیوں نہ گئے تھے جہاں ہم گئے تھے۔

آزاد! کہاں تھا اور کہاں آن پڑا۔ کجا ابو الفضل اہ

فیضی کا حال کجاسنی شیعہ کا جھگڑا۔

غرض تاریخوں میں صرف خشک تاریخی واقعات ہی ملتے ہیں۔ مگر دربار
 اکبری تاریخ کی کتاب بھی ہے اور ادب و انشا کا جن بھی، اس کے پڑھنے
 سے قدیم سوسائٹی آنکھوں میں جینے لگتی ہے۔ اس کے تیوروں کا نقشہ کھینچ کر
 سامنے آجاتا ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم اپنے آبا و اجداد کے گروہ میں
 داخل ہو گئے ہیں اور کچھ دیر کے لیے ان کے ساتھ رہنے لگے ہیں۔

یہی تاریخی واقعات جب کسی یورپین کے قلم سے قلم بند ہوتے ہیں تو
 ان کا رخ بدل جاتا ہے یورپین اپنی سوسائٹی کے آئین سے خود اتنا بے خبر
 رہتا ہے کہ اس کو خود خبر نہیں رہتی۔ گویا سوسائٹی کے حالات اس کے لیے
 رازدروں پر وہ ہوتے ہیں۔ جن سے اس کی لاعلمی ایک بدیہی امر ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ دربار اکبری کی مجلس آرائیاں دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے کہ آزاد میں یہ عجیب و غریب کمال ہے۔ جب کہیں رزم کا نقشہ دکھاتے ہیں تو راحت حیات اور سکون زندگی کو مجسم کر کے سامنے لے آتے ہیں۔ رزم کی تصویر اترتے ہیں تو تلواروں کی چمک دمک الفاظ میں پرتو شکن ہو کر اپنا روپ دکھاتی ہے۔ اس کو پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واقعات ان کے الفاظ و خیالات کے غلام ہیں۔

قلم جہاں چاہتا ہے دست بستہ باجولاں قصوں اور کہانیوں کو سمیٹے ہوئے کھینچ کر لے جاتا ہے۔ کاغذی پیرمین پر گل بوٹے بنا تا ہے کہ دیکھنے اور پڑھنے والے ساکت ہو جاتے ہیں۔ ان پر ایک کیفیت سی طاری رہتی ہے۔ کبھی طوفان کی آنکھیاں چلاتے ہیں تو اوسان خطا ہو جاتے ہیں، میدان جنگ کا ہولناک نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ کبھی نسیم سحر کی ہلکی ہلکی لہروں کو فضا ئے قریطاس پر رقصان ہونے کے لیے بلا لیتے ہیں۔ واقعات اصلیت کا بھیس بدل کر دل و دماغ کی کائنات میں نیا جنم لیتے ہیں۔

تتمہ ۶۳ صفحات پر حاوی ہے، جس میں آصف خاں سے ابتدا کر کے ہیوبتقال پر انتہا کر دی ہے۔ ضمیمہ میں دُچپ اور تاریخی معلومات کا ایک خاکہ ہے۔ اس طرح دربار اکبری ختم کر دی ہے، جس کو زیادہ تراکم بائی

ہی کہنا پڑتا ہے کیونکہ اکبری کا زناموں کی ایک داستان ہے اور آزاد کی زبان میں جن کی نسبت کچھ لکھنا ہمارے بس کی تو بات نہیں۔ شعر

ہو جو اس جیسا تو صفاس کا لکھے آج اس جیسا گر پیدا کہاں

بقول ڈاکٹر سید سجاد ”ایک ایسا طرز جس کا مستقبل ناہید ہے“

سیرا ایران یہ سیاحت ایران پر لکھا ہوا ایک ۸۶ صفحات کا روز نامہ ہے۔ جناب آغا محمد طاہر نے اس پر دیباچہ لکھا ہے، اس میں اس سفر کو اختیار کرنے کی وجوہ، ترتیب و تشکیل کے اسباب و علل، اس کی نوعیت غرض ساری کی ساری باتیں لکھ دی ہیں۔ وہی شکوہ جو فی زانہ ہر شخص کو ہوتا ہے مثلاً انھوں نے اپنے آبا و اجداد کے کتب خانہ کو بڑھانے اور اس کو از سر نو ترتیب دینے کی ٹھانی، جس کے لیے اکثر ایسے اتفاقات پیش آئے کہ ایک نہ ایک نئی کتاب کی ان کو ضرورت محسوس ہوتی اور باوجود تلاش بسیار وہ نہ ملتی اور ان کی تشنگی حد سے تجاوز کر جاتی، جس کے ثبوت میں انھوں نے کیا معقول بات لکھی ہے۔

”صاحب تصنیف انتظام جلتے ہیں کہ بعض دفعہ گلستان کا

ایک صفحہ دیکھنے کے لیے سکندر نامے کی ضرورت پڑ جاتی ہے اور بے

اس کے دیکھ آگے بڑھنے کو دل نہیں چاہتا۔ اسی رنج میں حد آئے

التجاک کی کہ اگر مجھے وصعت ملے تو ایک کتب خانہ نظر گاہ خاص و عام میں

آراستہ کروں اور ہرفن کی کتابیں اس میں رکھوں کہ کسی قسم کے ضرورت مند کو کسی بد دماغ سے التجا کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔“

غرض اس اہم ضرورت کو پیش نظر رکھ کر انھوں نے اپنی آمدنی کا معقول حصہ پس انداز کیا، خانہ بربادوں کی سہی زندگی بسر کی، اس اثنا میں اگر کوئی کتاب حسبِ دل خواہ مل جاتی تو کتب خانہ کے لیے خرید لیتے رفتہ رفتہ عرب و ایران کی دھن سمائی کہ جو کتابیں یہاں نایاب ہیں وہ بہت آسانی سے اور ارزاں قیمت پر وہاں مل جائیں گی، چنانچہ انھوں نے یہاں سے حرکت میں برکت محسوس کی، پنشن تو ہو ہی چکی تھی، مگر مصیبتیں تنہا نہیں آتیں، مصائب جب آتے ہیں دیوانہ بادلوں کی طرح امنڈے ہوئے چلے آتے ہیں، انھیں دنوں گردشِ تقدیر نے انھیں چند دل شکن صدمے پہنچائے، ان کی جوان بیٹی کی موت ایک فہرِ آسمانی بلا بن کر ان پر نازل ہوئی۔ جس حادثہ نے ان کا دماغی توازن بگاڑ دیا، لیکن چونکہ اس سفر میں کئی اہم مقاصد بھی آگئے اور خاک وطن کو سفر کا بیوند دکھانا بھی ایک فرض معلوم ہوا اس لیے رخصت کی درخواست دھڑلے سے پیش کی، اس کے حاصل کرنے میں بڑی دشواریوں کا سامنا ہوا، لیکن آخر مل گئی۔ ان کے سفر کی خبر سارے شہر میں آگ کی طرح پھیل گئی، خویش و اقارب نیز احباب نے حتیٰ الوسع روکنے کی کوشش کی کہ پہلے ہی صدمہ اور ضعف نے ادھ موا کر رکھا ہے سفر ذرا

ہے، لیکن آزاد کانشہ ان ترضیوں سے نہ انز سکا، وہ دھن کے پتے اور ارادے کے پتے تھے، انھوں نے سب کو اس کا احساس دلایا کہ ملک جس چیز کا محتاج ہے، قوم کے مستقبل کے لیے جو چیزیں درکار ہیں ان کا مہیا کرنا ان سب سے افضل ہے، خصوصاً فارسی کی جامع اللغات کہ بغیر فارس گئے اس کی تکمیل ناممکن ہے۔

صفحہ ۱۱ سے آزاد کا لکچر ہے جس میں انھوں نے پبلک کو ”شرفائے قوم“ کہہ کر مخاطب کیا ہے، یہ لکچر ۵۴ صفحے پر ختم ہوا ہے، اس لکچر میں دو ان سفر کے حالات ہر شہر کو دیکھنے کے بعد اس کے تاثرات نہایت لطیف پیرایہ میں بیان کیے ہیں، ایک نظر فریب خاکہ کھینچا ہے جس پر سادگی قربان ہے۔ ۲۳ ستمبر ۱۸۵۷ء بجے شام لاہور سے روانہ ہوئے ۲۵ء کو کراچی

داخل ہوئے، یہاں پہنچ کر یہ سنا کہ جہاز کل ہی نکل چکا ہے، چارونا چار اپنے ایک عزیز و سعید شاگرد مولوی عمر الدین ہیڈ اسٹرڈرس کے مہمان تھے۔ انھوں نے انھیں اتنے خلوص و محبت سے رکھا کہ سفر میں گھر کا لطف آگیا، اور یہ ۸ روز چشم زدن میں گذر گئے۔ ۲ اکتوبر جمعہ کے روز عربیہ (عرب) ڈاک کے جہاز سے (عہد) روپیہ کرایہ دے کر روانہ ہوئے، جہاز کی نقش بر آب زندگی کو ایک دُنشیں پیرایہ میں لکھا ہے۔ جہاں جہاں سے جہاز

گذرا ہے وہاں کے مناظر و واقعات کو الفاظ کے خوشنما سانچوں میں ڈھال کر پیش کیا ہے، ۱۰۔ اہ اکتوبر کو ان کا جہاز بوشہر پر دم لیتا ہے، جہاں ۷۔ روز بھر تہہ ہیں، ایک تمام ایرانی رہوار کرایہ پر لیا اور کاروان میں جاسٹال ہوئے، یہ گھوڑے پر سوار تھے، قافلہ تمام شب چلتا رہا غرض اسی طرح چلتے پھرتے راستہ کی تکلیفیں برداشت کرتے، کچھ سوار کچھ پیدل شیراز پہنچتے ہیں، جہاں پر کچھ اپنے مطلب کی شراب انھیں ملتی ہے، یعنی کتابیں، جن کی جستجو انھیں یہاں کھینچ لائی، شیراز کے اطراف و اکناف میں گھومتے ہیں وہاں کے مقامات کی نسبت جو بیان ہے اس کو فارسی میں لکھا ہے، خواجہ حافظ اور شیخ سعدی کا وطن ہونے سے شیراز کی ہر لغزیزی، وہاں کے مدارس کا حال اور ان کا ہندوستانی مدارس سے تقابل، حافظ و سعدی کا قبر کی زیارت، شیخ سعدی کی قبر کا کتبہ تمام کا تمام نقل کیا ہے، اس شعر سے جس کی ابتدا ہوتی ہے۔

کریم السجایا جمیل الشیم نبی البرایا شفیع الامم
غرض شیراز کی ہر نبض دیکھی ہے، وہاں کے اس مشہور تحفہ گل گل کا بھی ذکر ہے، یہ خوشبویں بسی ہوئی، ٹکیاں ہوتی ہیں جن سے لوگ سر اور ڈاڑھی دھوتے ہیں اور یہ شیراز کا مشہور تحفہ ہے، اس کو دیکھنے سے آزاد کو

گلستاں کا وہ سبق یاد آیا۔

گل خوشبوئے درحام روزے

چھ لکھتے ہیں ”شیراز جب دیکھ لیا تو بڑھاپے نے خوف کے لحاف میں دبک کر کہا اب اصفہان دیکھ اور آگے بڑھ کہ تلاش کی منزل ابھی دور ہے۔“ اب یہ قافلہ کے ساتھ اصفہان جا رہے ہیں، راستہ میں جو مناظر پڑتے ہیں ان کے بیان میں شاعرانہ گھلاوٹ موجزن ہے۔ شاہ عباسی کی سراؤں کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے جن کی تنگی اور وسعت قلعوں کو ٹکرا مارتی تھی، ان سراؤں میں اگر مسافر روپیہ رکھتا ہو تو خاطر خواہ سامان آسائش کا اس کو مل سکتا ہے۔ چار پانچ آنے کو مرغ اور پیسے کے دو دد اندھے، تر و خشک میوے نہایت اعلیٰ اور ارزاں ملتے ہیں۔ اسی طرح تمام راہتے آب رواں سے سبز و شاداب آبادیوں سے معمور ملا۔ جہاں ٹہرتے وہاں کے اہل علم کا پتہ دریافت کرتے اور ان سے جاملتے، زندہ رود (وہ دریا جس نے اصفہان کا تمام علاقہ زندہ کر رکھا ہے) دیکھ کر بے خود سے ہو جاتے ہیں اور شعرا کے اس تنخیل کی تائید کرتے ہیں۔

جہاں را آگاہ صغہا نے نبود جہاں آفرین را جہا نے نبود

یا پھلپنے تجربہ اور مشاہدہ کی بناء پر اس خیال کو تسلیم کرتے ہیں۔

اصفہان نیمہ جہاں گفتند نیمہ وصف اصفہان گفتند
 ایک جگہ لکھا ہے ”یہ شہر سلاطین صفویہ کی بہتوں کا عجائب خانہ ہے“ سفر میں
 بڑی تکلیفیں بھی اٹھائیں، کہیں فاقہ گذرا، کہیں سیر ہو کر کھلایا۔ اب اصفہان
 سے پندرہ منزلیں طے کر کے طہران پہنچتے ہیں، لوگ اسے ایران کا دارالخلافہ
 کہتے ہیں، لیکن حقیقت میں شاہ کی برکت ہمت سے آج علوم و فنون بہت تہذیب
 اور دولت و اقبال کا دارالخلافہ ہے، طہران کا ذکر بھی کافی تفصیل سے کرتے
 ہوئے اہل مدللے سفر یوں ظاہر کیا ہے۔

”مجھے اس سفر میں بڑی غرض کتابوں کی تلاش تھی اور
 اس سے زیادہ یہ خیال کہ جامع اللغات فارسی کے لیے سرمایہ جمع
 کروں، چنانچہ وہاں کے صاحب علم و فضل کے حضور میں پہنچا،
 انھوں نے کتب خانہ آزاد کے لیے دو دو نسخے کتابوں کے دیے“
 پھر طہران میں ٹہرنے کی بڑی دو ضرورتوں کا ذکر ہے۔ ”اول کتابیں
 دوسرے تحقیقات الفاظ“ یہاں سے مشہد مقدس کا رخ کرتے ہیں، طہران
 و مشہد کے واقعات بھی سب فارسی میں لکھے ہیں، مشہد سے سمنان جاتے
 ہیں جہاں سے شعر سمنان اور امار سمنان لوگ تحفہ لے جاتے ہیں۔ اسی
 سلسلہ میں دامنان، شاہ رود، بسطام، مبرزوار، نیشاپور سب ہی دیکھ لیا“

مشہد سے ہرات چلے ہیں۔ اسی سفر میں ایک حادثہ سے دوچار ہوتے ہیں۔ قافلہ شتری تھا، غفلت کی نیند سو رہے تھے کہ اونٹ سے گر پڑے۔ ایک پسلی ٹوٹ گئی۔ غرض یوں تیوں ہرات پہنچتے ہیں۔ جہاں ۲۸ دن قیام رہا اور جو تجربے ہوئے اس کا یوں ذکر کیا ہے۔

”مجھے یہاں ایک ایک دن پہاڑ تھا، سب سے زیادہ

تنگ کرنے والی چیز وہاں کے بچے سے لے کر بوڑھے تک کے

پسیم سوالات تھے، جن سے طبیعت اکٹا گئی تھی۔ کہاں سے آتے

ہو، کیوں آئے ہو، کس راستہ آئے ہو، غرض ہر نوع کے سوالات۔“

بے کار و بے ضروری بحث جس سے یہ قریب قریب بیزار تھے اور ایران کو

یاد کرتے تھے کہ وہاں مہینوں رہا مگر کبھی جی نہیں اکتایا، ہرات ایک ایران

شہر تھا مگر اندرون شہر گوہر شاد بیگم کی بنائی ہوئی مسجد جو اپنے علوے

رفت و شان میں خدا کی یاد تازہ کر دیتی تھی اس شہر کی رونق کو بڑھا دیتی

تھی، لیکن شہر میں سلاطین تیموری کے ٹکروں نے اسے پامال کر دیا۔

ثابت یہ ہوا کہ شہر ہرات شہرہ سے شہرہ تک شہزادگان تیموری کی

قسمت آزمائی کا دنگل بنا رہا پھر مختلف مناروں، مقبروں اور مساجد کا

ذکر ہے۔ مولنا جامی کی قبر کی بھی زیارت کی۔ پس ہرات سے قندھار

چل پڑے۔ ۲۶ دن میں قندھار کی منزل طے ہوئی، بعد مسافت کا سبب ملک کی ویرانی اور غیر آبادی تھی راستے میں بڑے مصائب بھیلے۔ بعض اوقات سوکھی روٹیاں پانی میں ڈبو کر کھائیں۔ ہم سفر اشخاص نے انہیں کافر سمجھا، اس طرح آزاد کو اثنائے سفر میں ”کافر بننے کا بھی اتفاق ہوا“ قندھار میں ۵ روز قیام کیا، وہاں بھی وہی سوال و جواب نے انہیں پریشان کیا جن سے پیچھا چھڑا کر ہرات سے نکلے تھے، وہاں سے کوئٹہ روانہ ہوئے جہاں صرف ایک روز رہ کر دوسرے دن چھکڑے پر کتا میں لادیں اور دو دن ایک رات میں بمقام زندکی پہنچے، اس طرح ان کا سفر ۸۰ صفحات کے حجم پر محیط ہے۔

خاتمہ، طاہر صاحب نے لکھا ہے جس میں سیرایران پر ایک تنقیدی نظر ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ آزاد نے یہ سفر نامہ کیونکر مرتب کیا جو مصنف کے اصلی جذبات و کیفیات کا آئینہ ہے، جہاں فارسی لکھی ہے اس کی شان ہی نرالی ہے، روزنامچہ کا لحاظ کرتے اردو کی آن بان الگ ہے۔

سخندان فارس | اردو زبان میں سب سے پہلے لسانی مسمعی سے آزاد نے بحث کی ہے، ان کی کتاب پڑھ کر لوگوں نے ہندوستان میں سب سے پہلے یہ سمجھا کہ زبان کی تاریخ میں علم و فن کا کوئی شعبہ ہے، اگرچہ

یورپ میں بھی اس فن کی ابتدا کو کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ ویبر نے ویدک اور سنسکرت زبان کی بحث ۱۸۵۷ء کے قریب اور میکسر

نے بھی اسی زمانے کے لگ بھگ اس کا بیڑا اٹھایا، ان لوگوں کے بعد ہی آزاد نے ان مباحث کو اردو زبان میں چھیڑ دیا، جن مباحث کو میان کرنے کے لیے ہماری زبان میں زبان نہیں ہے۔ انھیں مباحث کے لیے اردو زبان کو اپنے قدیم مقام سے اٹھا کر انھوں نے نئے خیالات ادا کرنے پر لگایا ہے۔

حقیقت میں یہ فن کسی ماہر کا ریکر کی چابک دستی کا محتاج تھا اور اپنے عہد طفولیت میں پڑا تھا، اس کے مسائل پر کامل روشنی نہیں پڑی تھی مگر خیر جو کچھ بھی تھا انھوں نے اس کو سمجھا اور اس زبان میں سمجھایا جس کو حادث عالم کی ہولناکی نہ لگی تھی اور یہ آزاد ہی کا حوصلہ ہے کہ وہ زبان پر ایسی قدرت رکھتے ہیں۔ پس اس طرح زبان کا فطری شوق جو قدرت

نے ان میں رکھا تھا وہ زبان کے عالمانہ اور محققانہ تیور دیکھ کر اور بھی چمک اٹھا۔ چنانچہ یہ عقدہ اب ہم پر اچھی طرح کھل گیا کہ آزاد نے نہ صرف اشخاص کی تاریخ ہی لکھی ہے بلکہ زبانوں کی بھی تاریخ لکھی۔ نہ صرف تاریخ بلکہ یوں کہیے کہ فلسفہ زبان کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے اور اس راستہ سے دنیائے ادب کو روشناس کیا ہے۔ یعنی زبان کی اصل، ایزان کا

دوسری زبانوں سے تعلق، الفاظ کی اصل اور معنی کے تغیرات کے اسباب سے بھی عالمانہ بحث کی ہے، بقول مولانا سعید انصاری بی، اے

”یہی علم آج مدون صورت میں علم الاسنہ یا انگریزی میں

”فیلالوجی“ کے نام سے موسوم ہے جس کا شوق انہیں اہل یوبہ

کی غیر زبانوں میں تحقیق و تفتیش کو دیکھ کر پیدا ہوا۔ چنانچہ اظہل

نے سب سے پہلے فارسی زبان کی تاریخ و تحقیق کی طرف توجہ کی

اور اس کے لیے ایران اور بخارا وغیرہ کی دشوار گزار مسافت بھی

اختیار کی“

اس طرح آزاد نے ایران وغیرہ کے قدیم رسم و رواج کا مقابلہ ہندوستان

کے رسوم کے ساتھ کیا ہے اور اپنی سیاحت ایران کے دلچسپ حالات متوقع پر

درج کیے ہیں، نہ صرف سیاحت و مسافت بلکہ وہاں کے میلے ٹھیلے دیکھے، شادی

وغنی کی محفلوں میں حصہ لیا اور یہ مواد تیار کیا۔ (غرض ان کی اس علمی و

لسانی تحقیق و تدقیق کا اصلی منظر ”سخندان فارس“ ہے جو بذات خود فارسی

زبان کی ایک کل تاریخ ہے۔ یہ مصنف کی پندرہ برس کی محنت و جان کا ہی

ثمر ہے اور نہایت قابل قدر و دلچسپ کتاب ہے) علاوہ سفر کے حالات

اور اپنے ذاتی دلچسپ تجربوں کے قابل مصنف نے اس میں مختلف زبانوں کے

مقابلہ سے قوموں کے باہمی رشتوں کے مٹے ہوئے سراغ لگائے ہیں۔ تہذیب پہلی درجہ سنسکرت کے الفاظ کا مقابلہ کر کے تاریخی نتائج نکالے اور مشہور مصنفین کی نظم و نثر کے مابہ امتیاز پہلو دکھائے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ زبان فارسی کی ایسی تاریخ اب تک ہندوستان میں اس سے قبل نہیں لکھی گئی۔ فیلا لوجی کا فن زبان کے روشناسوں کے لیے آسان کر دیا۔

آغا محمد طاہر اس کی نسبت دیا چہ میں لکھتے ہیں۔

دو سجدان فارس نام تو آپ کی کتاب کا ہے مگر درحقیقت
 سجدان فارس خود بدولت ہی تھے۔ فیضی ابو الفضل ہوں یا
 ہمارے مرزا غالب مرحوم ان حضرات نے فارسی کی تحقیق و
 تدقیق میں حضرت آزاد حبیبی کاوش اور محنت نہیں اٹھائی،
 ان حضرات کی بڑی عرق ریزی یہ تھی کہ اپنے گھر میں یا اپنے
 شہر میں فارسی دواویں، فارسی علم ادب کی کتابیں یا فارسی
 زبان کے لغت اور فرہنگیں پڑھ لیں یا ترک افغان وغیرہ جو
 ایران و توران سے دلی، آگرہ وارد ہوئے ان کی گفتگو سن کر
 اپنے ذہن رسا اور حافظہ خدا داد کے ذریعے سے محاورے یاد
 کر لیے، مگر فقہ زمین بر سر زمین پورا ہوتا ہے، فارسی زبان کی

تحقیق کے لیے ان میں سے ایک صاحب بھی دلی کے کابلی دروازہ سے باہر نہ نکلے۔ یہ حضرت آزاد ہی کا جگر اور حوصلہ تھا کہ سفر کی مصیبتیں اور تکلیفیں جیل کر فارس کی سرزمین میں پہنچے۔“

اس کا حجم ۱۳ صفحے ہے۔ یہ جامع تاریخ لسان مندرجہ ذیل پر مشتمل ہے۔ تمہید خود آزاد نے لکھی ہے جس کی تاریخ ۵ اگست ۱۸۸۸ء ہے، لیکن یہ چھپی ۱۹۰۷ء میں۔

حصہ اول میں علم اللسان پر بحث کی ہے۔ لغات اور زبانوں کے فلسفیانہ تحقیقاتی اصول بتائے ہیں، انسان کے حیوان ناطق ہونے پر ایک مدلل بحث ہے جس میں فن تقریر کی ہندی کی چندی کر دی ہے (زبان کے جینے اور مرنے کے اسباب بتائے ہیں کہ اس کے ہست و بود کا دار و مدار کس پر ہے۔ وہ کیونکہ پنیپ سکتی ہے۔ سنسکرت اور فارسی کا بہنایا کہ کیسے ایک کا گہرا لگاؤ دوسرے سے ہے۔ مثلاً

آستان فارسی میں گھر کی دہلیز کہتے ہیں،ستان کثرت ظرفی کے لیے آتا ہے۔ جیسے گلستاں، بوستاں سنسکرت میں سنتھاں عموماً جگہ کو کہتے ہیں۔ شنا فارسی، اردو اس کی تیزنا، سنسکرت میں سنان ہنا اور ظاہر ہے کہ بے نہائے کے تیزناک ہو سکتا ہے۔ اسی طرح سینکڑوں الفاظ کا حوالہ

دے کر ثابت کر دیا ہے کہ فارسی اور سنسکرت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

پھر ۵۰-۶۰ صفحوں میں فارسی اور سنسکرت کے متحد الاصل لفظوں میں کن اصول کے بموجب تبدیلیاں ہوئی ہیں اس پر ایک مبصرانہ بحث ہے۔
(حصہ دوم میں آزاد مرحوم کا پہلا لکچر ”فارسی قدیم کی تاریخ“ پر ہے

ایران و اصفہان کی تعریف میں دریا بہا دیے ہیں۔ مثلاً

”ایرانیوں کی مہمان نوازی، ان کے آداب محفل ان کی

تغظیم و تکریم کے طریقہ ان کے گہروں کی آرائش آج تک علم
تدبیر المنزل کے لیے نمونہ ہیں۔ اتنی بربادیاں اٹھا کر جب اس کا

یہ حال ہے تو اس وقت کیا عالم ہوگا۔ یہی سبب ہے جو یورپ

کے اہل نظر نے پیرس دار الخلافہ فرانس کی زیبائی اور خود آرائی

دیکھ کر اسے خاتون دنیا کا خطاب دیا اور مورخوں نے کہا کہ

جس طرح وہ یورپ میں خاتون ہے ملک ایران ایشیا میں

خاتون ہے۔“

(دوسرے لکچر میں ملک فارس کی پرانی زبانوں کے حالات درج میں

تیسرے میں یہ بتایا ہے کہ فارسی زبان نے اسلام کے بعد کیا کیا رنگ بدلے

چوتھے میں فارس کی مروجہ زبان میں دوسرے انقلاب پر بحث کی ہے۔

پانچویں لکچر میں قدمائے وارس کے اصول شرعی اور رسوم عرقی بتائے ہیں۔ چھٹے میں اسلام کے بعد اہل ایران کے اداب و رسوم اور رہنے سہنے کے طریقوں پر روشنی ڈالی ہے، ساتواں لکچر آزاد کی رنگین بیانی کا ایک دلچسپ مرقع ہے۔ اس میں انھوں نے اپنی جادو بیانی کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے یعنی ہر ملک و سرزمین اور اس کے موسم کی بہار و انشا پر دازری پر کیا اثر کرتی ہے مثلاً ان کے اس لکچر کا ایک لطیفہ جو خود انھیں کے مخصوص انداز بیان کا نمونہ ہے اس کا یہاں نقل کرنا خالی از حجبی نہیں۔ پہلے تو یہ کہ تقریر کے دوران میں لطائف و طرائف کا لانا تقریر کی یکسانیت اور اداسی میں ایک رونق اور چہل پہل پیدا کر دیتا ہے، آزاد کے بالعموم ہر لکچر میں کچھ نہ کچھ لطیفے ہوتے ہیں۔ لکھتے ہیں لطیفہ ”تین شخص ہم سفر تھے۔ سنار، پیرو والا، اور نان بائی

شام کو ایک جگہ جنگل میں اترے، بستر ایسے مقام پر ہوئے کہ

سلنے کو سول تک کھلا میدان تھا، منہ ہاتھ دھویا، کھانا

کھایا۔ جب کچھ رات ہو گئی، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی،

دل شگفتہ ہوئے، ۳۳-۳۴ تاریخ تھی، چاند سامنے سے نر کاٹا

سناسنے کہا، آہا کندن ڈلک ڈلک کرتا ہے، ابھی کٹھالی

سے سبز کا لا ہے۔ پیرو والا بولا: ثابت چکتی ہے، ابھی چاکو نک

نہیں چھوایا۔ نان بائی نے کہا، یہ تو میرے تنور سے پھر پڑاقتی
روٹی نکلی ہے، دیکھو جو شخص جس جس حال میں تھا ویسے ہی
خیال اس کے دل میں پیدا ہوئے۔ شعر

گر خیالت گلشن است تو گلشنی و ریخت گلشن است تو گلشنی

اسی لکچر میں فصحاء عرب اور ہند کے انشاء پرداز کا مقابلہ کرنے

میں اپنی سحر بیانی کا کافانی ثبوت دیا ہے مثلاً

عرب کا فصیح البیان جب معشوق کی تعریف کرتا ہے تو آنکھ کو ہرن

یا گاودشتی کی آنکھ کہتا ہے۔ زلف کو کوئلہ یعنی زغال کہتا ہے اور جب باؤں کے

رنگ و بو کو زیادہ چمکاتا ہے تو لوگوں بھی پیس کر ڈالتا ہے، مگر مشک وغیر

کی بو سے بھی خافل نہیں ہے، ہونٹوں کا سیاہی مائل ہونا قابل تعریف

سمجھتا ہے، ملک گرم ہے، رنگ کالے ہیں، دانتوں کو کبھی اولالکھی گل بابونہ

کہتا ہے، انہیں چمکاتا ہے، مگر مسوڑوں پر سرمہ چھڑک کر سیاہ کرتا ہے،

گردن کو بت کی گردن سے تشبیہ دیتا ہے، اس حضرت صلعم کے حلیہ میں ”عیدہ

کجید دمیہ“ لکھتا ہے۔

ہند کا انشاء پرداز زلف کی تشبیہ میں بھونرے اڑاتا ہے اور سانپ

کے پھن بھی لہراتا ہے، آنکھ کے لیے کنول کے پھول دکھاتا ہے۔ مولے کی

اچھا لٹ دکھاتا ہے، جی چاہتا ہے تو ہرن سے بھی آنکھ لڑا لیتا ہے، دانست موتی کی لڑیاں ہیں۔ یہ تشبیہ مشترک ہے، ناک کو طوطے کی چوہ سے تشبیہ دیتا ہے کہ خاص ہند کا جانور ہے، غرض اسی بیچ سے معشوق کا سراپا کھینچا ہے، ہندو عرب کی انشا پردازی کے بیان کرنے میں اپنی رنگینی بیانی کے گنجل بوٹے کہلائے ہیں، ایران کے ہر موسم کا ایک دلاوینہ خاکہ کھینچا ہے اور اس کو اپنی خوش بیانی سے سجایا ہے۔

(آٹھویں لکچر میں زبان فارسی کے انداز بیان کو اور زبانوں کے انداز بیان سے جو نسبت ہے اس پر بحث کی ہے) اس لکچر کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں ”آج کا لکچر اس مضمون پر ہے جو فارسی کے عالم کا نفس ناطقہ ہے“ اور ایشیائی زبانوں کے اہل ذوق کے اس مقولہ پر ”فارسی شکر است، ترکی ہنر است ہندی نمک است“ پر ایک معقول و مدلل بحث کی ہے۔

(نواں لکچر فارسی اور عربی کے ملاپ سے جو رنگ نکھرا اس پر محیط ہے، دسویں لکچر میں یہ بتایا ہے کہ فارسی پر ہندوستان آکر کیا کیا رنگ چڑھے، گیارہویں میں نظم فارسی کی تاریخ قلم بند کی ہے) اس میں بھی ایک لطیفہ یعقوب ابن صفار کا لکھا ہے، جن میں اس نے اپنے خور و مال بچے کی زبان سے الرطہ پن میں نکلے ہوئے فقرے پر جو بذات خود ایک مصرعہ تھا،

علمائے وقت کو حکم دیا کہ اس کا قاعدہ باندھو، چنانچہ انھوں نے اس مصرعہ کی تطلیع کی اور بحر ہزج کی ایک شاخ نکالی اور اس کے بعد اس کے بڑھتے بڑھتے یہاں تک نوبت پہنچی، پھر طبقات شعرائے فارسی کا ایک خاکہ کھینچ کر بتایا ہے کہ کس عہد میں کون کون شعراؤ گزرے ہیں، اسی سلسلہ میں آدم الشارء زود کی کے کلام پر بحث کی ہے، پھر فردوسی پر اپنے قلم کا نکہار ختم کر دیا ہے، محمود غزنوی اور بدقسمت فردوسی کے قصہ کو جس کو ہزار بار سننے سے بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی اپنے زور قلم سے یوں آراستہ کیا ہے :-

”اس کی نظم کے دبدبہ سے دربار گونج اٹھا، محمود بہت خوش ہوا، نظم شاہنامہ کے لیے حکم دیا ایک اشرفی فی شعر انعام مقرر کیا، فردوسی نظم شاہنامہ میں مصروف ہوا۔ وہ اس کی محنتوں کا کارنامہ اور عرصہ کی کمائی ۶۰ ہزار شعرا کا مجلا ہے کہ ۳۰ برس کی جگر خراش میں تیار ہوا، چنانچہ خود لکھتا ہے شعرا

یسے رنج بردم درین سال سی عجم زندہ کردم بدیں پارسی“
شاہنامہ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے رستم کے ساتھ دلی محبت تھی، جیسے ایک بچہ کو پال چس کر کوئی پروا ان چڑھاتا ہے اور اس کی بہار زندگی دیکھ کر خوش ہوتا ہے، یہی حال اس کا ہے۔ اس نے رستم کے

کارناموں کو اس جوش و خروش سے لکھا ہے کہ کسی کا حال ایسا نہیں لکھا گویا اس تصنیف سے مقصود اسی کا حال سنانا تھا اوروں کا بہانہ تھا۔ شعر

جہاں آفریں تاجاں آفرید سوارے چورستم نیامد پدید

پھر ناصر خسرو، اسدی طوسی، عنصری، منوچہری، فرخی وغیرہ کے کلام پر ایک مختصر سی بحث کی ہے اور یہی آخری لکچر ہے، آخر میں خاتمہ پر اہل طلبہ کے تقاضوں سے جو کتاب کو ختم کر دینا پڑا ہے اس کا ذکر کیا ہے۔

تاریخ خلیفہ سید محمد محسن صاحب مخلص بہ متین نے لکھی ہے۔ مقطع

ہے۔ شعر

کہ۔ ہین۔ شتاب گو اے متین بلام و کاشت
بسا مفید سخندان فارس از آزاد۔

۱۳

۵

۲۴

نگارستان فارس | اس سلسلہ کی دوسری کڑی ہے جس میں زود کی سے لے کر واقف بٹالوی تک کے مشاہیر شعراء کی سوانح عمریاں ہیں۔ حالاتِ زندگی کے ساتھ ساتھ کلام بھی درج ہے، یہ بھی آزاد کا تاریخی کارنامہ ہے، اس کتاب کو آغا محمد طاہر نے ۱۹۲۲ء میں طبع فرمایا، ۲۳۲ صفحات اس کا حجم ہے، آخر میں ”عرض کیفیت“ کے عنوان سے طاہر صاحب نے اظہارِ حال

کیا ہے جو ہم صنفوں پر محیط ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں :-

”افسوس کہ اس وقت علامہ شبلی زندہ نہیں، وہ ہوتے تو اس تذکرہ کو دیکھ کر حضرت آزاد کے کمال کی داد دیتے، کیونکہ ”وئے برجان سخن گر بہ

سخندان نہ رسد“ قدر جو ہر شاہ داند یا بداند جو ہری۔

وہ خود مورخ اور تذکرہ نویس فارسی کے زبان دان اور شاعر مجمع علوم فنون تھے، حضرت آزاد کی کتابوں کو بہت عظمت کی نظر سے دیکھتے تھے اہل

کمال اپنے ہم پیشہ و ہم رتبہ کی ضرورتظیم کرتے ہیں“

اس میں تاریخ کو ادبی رنگ میں پیش کر کے، ہر قصہ میں ایک نیا پہلو اختیار کیا ہے۔ مثلاً ایک مقام پر میر معز الدین موسوی خان فطرت (عہد عالمگیر کا ایک صاحب کمال تھا) کے بیان میں ایک لطیفہ قابل ذکر ہے۔

”ایک دن کوئی شاعر یا وہ گوا اپنے اشعار میر کو سناتا تھا اور داد دیتا تھا، کسی مقام پر ایک لفظ غلط ایسا بیہودہ باندھا تھا کہ میر نے ٹوکا۔

اس نے کہا کہ ضرورت شعر کے لیے، میر نے کہا تمہیں شعر کہنا کیا ضرور تھا“

ایک اور موقع پر لکھا ہے۔

”میر نے ایک دن اپنی ولادت کی تاریخ خود اس طرح

بیان کی کہ افضل اہل زمانہ، سرخوش نے عرض کی کہ میں بھی

اسی سال پیدا ہوا ہوں یہ تو مجھے عنایت ہو کیونکہ میرا تو نام بھی
افضل ہے۔ آپ اپنے لیے اور کہہ لیجیے گا، ہنس کر کہا اچھا خدا
مبارک کرے۔“

آغا طاہر کو یہ کتاب کس طرح ہاتھ آئی اس کے بیان میں خود انھیں کا
طریق بیان ملاحظہ ہو:-

”حضرت والد صاحب کے انتقال کے بعد جب میں لاہور
آیا تو سب سے پہلے عبرت کی نگاہیں انہیں پلندوں پر پڑیں
حیران ہو گیا کہ افسوس حضرت آزاد کے جسمانی فرزند تو یوں خاک
کے پیوند ہو گئے اور معنوی فرزند جنھیں مولانا اپنے بچوں سے
زیادہ عزیز جانتے تھے اور جان چھڑکتے تھے، ان پھٹے پڑے بستوں
میں سوتے کے سوتے رہ جائیں گے، حضرت آزاد تو اب بار بار آنے
سے رہے، جو انھیں بنا ئیں گے، سنواریں گے اور ایک سے ہزار
کر کے نکالیں گے، اب تو یہی غنیمت ہے کہ اس بہتے دریا میں سے
جو کچھ بھی ہاتھ آجائے، ان تمام باتوں کو سوچ کر ان مسودوں
بستوں اور گھٹوں کو کھولنا شروع کیا۔ کیا بتاؤں کہ ایک ایک
کاغذ کا ورق لاکھوں جانداروں کے کلیجے سے لیٹا نظر آتا تھا،

کیڑوں کی فوج کو کمال ہمدردی کے ساتھ رخصت کیا گیا۔ غرض
 اسی طرح روزانہ دو تین گھنٹے اس پھونکا پھاکی میں صرف ہونے
 لگے، انہیں دنوں میں ایک دفعہ جناب میر ممتاز علی صاحب سے
 ملنا ہوا تو باتوں باتوں میں مولانا کی غیر مطبوعہ کتابوں کا بھی ذکر
 نکل آیا، اس سلسلہ میں انہوں نے فرمایا کہ دیکھنا بھئی استاد
 آب حیات کی طرح ایک تذکرہ فارسی شعرا کا بھی لکھا تھا، تم
 ذرا خیال رکھنا، مجھے معلوم تو پہلے بھی تھا مگر اب یقین ہو گیا اور
 اس کی ٹوہ میں رہا جس اتفاق دیکھیے کہ ایک دن بستہ کھول کر
 بیٹھا تھا کہ سامنے ابو عبد اللہ رود کی نام لکھا نظر آیا، دیکھا تو
 اکثر مسودہ نگارستان کا تھا، اسی وقت میر صاحب کے پاس
 گیا، انہوں نے پہچانا تو مجھے کمال یقین ہو گیا کہ
 قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند
 نگارستان کا قلمی مسودہ مختلف نسخوں میں سے ملا۔ ایک جگہ جمع
 کیا تو تقریباً مکمل ہو گیا۔ تمام مسودہ خوش خط لکھا ہوا تھا سو اُسے
 چند شعراء کے حال کے جن کا پڑھنا۔ ع
 صبح کرنا شام کا لانا تھا جوئے شیر کا

ان کے علاوہ ایک دو پرچے بالکل ناقابل رکھنے اور پڑھنے کے
 لمے جنہیں منسل کی نوشت نے حرف غلط کی طرح مٹا دیا تھا۔
 مگر نظر گڑا دینے سے معلوم ہوا کہ غالباً مرزائے فارسی حضرت
 غالب کا ذکر ہے جن کو مولانا نے آبِ حیات میں بھی فارسی
 شاعر مانا ہے۔

بعض شعرا کے انتخاب کلام بھی نہ مل سکے۔ کیا جانے حالت
 جذب میں کہاں سے کہاں باندھ دیے، دو تین جلیل القدر
 شاعر بھی رہ گئے۔ مثلاً عمر خیام ابن مین وغیرہ۔ لیکن ان تمام
 باتوں کے باوجود بھی اس قدر شعرا کسی اردو کے تذکرہ میں
 نہ ملیں گے۔“

غرض آغا صاحب کی ہستی قابل قدر ہے اور باعثِ برکت
 کہ ان کے وجود مسعود نے آزاد کے عمر بھر کی کمائی و پونجی کو جو
 اسرارِ غیب کی طرح سرسبتہ تھی منصفہ شہود پر لانے کے سامان
 پیدا کیے اور انھیں اس ادبی شہسواری کا مردِ میدان بنایا وہ
 خود ”عرض کیفیت“ کے خاتمہ پر اپنی خود ساختہ داستان کو اس
 جملہ سے ختم کرتے ہیں۔ ”کلبس کو نئی دنیا دینے والے نے اس کے

بعد مجھے بھی پے در پے مولانا کے غیر مطبوعہ جواہر ریزے دلوائے،
 جو انشاء اللہ بہت جلد ہدیہ نظر ہونگے۔“

مکتوبات آزاد | اس کتاب کی نسبت حضرت ناصر زید فراق دہلوی دیبلہ
 میں لکھتے ہیں :-

”آزاد کے چاہنے والوں نے بہت چاہا کہ آزاد کی انشاء
 آپ کی شان اور درجہ کے موافق ضخیم بھی ہو، دسچپ بھی، مفید
 بھی۔ کچھ نہیں تو غالب کی اردوئے معلیٰ اور دہندی جیسی تو ہو۔ مگر
 یہ مراد پوری نہ ہوئی۔ شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹر لاٹ لائے
 سارے ہندوستان میں دہائی دی کہ جن صاحبوں کے پاس حضرت
 شمس العلماء آزاد کے خطوط یا رقعات یا مکتوب ہوں وہ ازراہ
 ہنر پروری ہمارے پاس بھیج دیں تاکہ ہم انہیں چھاپ دیں
 اور جو مولانا کے کمال کے بھوکے ہیں، انہیں فائدہ پہنچے۔ مگر ہوائے
 جناب میجر سید حسن صاحب بلگرامی کے کسی اللہ کے بندے نے
 جواب تک نہ دیا۔ میجر صاحب مدوح نے دریا دلی سے کام لیا
 اور آپ کے پاس جو ۳۰ - ۳۲ خط حضرت آزاد کے قلم جواہر
 رقم کے لکھے ہوئے رکھے تھے وہ بے دریغ بیرسٹر صاحب مدوح کے

پاس بھیج دیے اور بیرسٹر صاحب دایم اقبال نے وہ خطوط وقتاً
وقتاً اپنے رسالہ مخزن میں شائع کیے۔ خط کیا جواہر کے ٹکڑے تھے
جن کی خریداری کے لیے سارا ہندوستان امنڈ پڑا۔“

مکتوبات کا یہ مجموعہ ۲۶۴ صفحات کی تصنیف ہے، آزاد مرحوم کے دھچپ
خطوط جو گونا گوں دلفریبیوں کا مجموعہ ہیں وہ اس کی کائنات ہے ان میں
اکثر و بیشتر خطوط دوستوں اور شاگردوں کے نام لکھے ہیں۔ طاہر صاحب نے
اس میں بہا تصنیف کو مرتب اور سر عبد القادر کے نام معنون کیا ہے۔ اس
تہدید کے بعد مولانا آزاد کا ایک قلمی خط اپنے فرزند محمد ابراہیم کے نام ہے۔
جو ۷ جون ۱۹۴۷ء کا لکھا ہوا ہے، دوسرے صفحہ پر ان کی تصویر ہے۔ پھر
مستور فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب نے دیا چہ لکھا ہے ۸ صفحہ اس کی
تعلیف اور اس کے اغراض و مقاصد میں رنگے ہیں، گیارہویں صفحہ سے ۳۵ صفحہ
تک حضرت ناصر نذیر فراق دہلوی نسبہ خواجہ میر درد مرحوم نے ایک دھچپ
دستان لکھی ہے، جس میں اپنی شاگردی کا ذکر، مولانا آزاد سے ملاقات،
ان سے شرف تلمذ کا زرین موقع، آزاد مرحوم کی دیوانگی کے آخری ایام کا
عبرت انگیز قصہ بیان کیا ہے، اب یہاں سے مکتوبات آزاد کی ابتدا ہوئی
ہے، سب سے پہلا خط میجر سید حسن صاحب بگلرامی کے نام ہے۔ اس خط میں

اپنی انتہائی عظیم الفرصتی کا ذکر ہے۔ ”خطوط اور کارڈون کا ایک انبار پڑا ہوا ہے اور دو دوحرفوں میں سب کو ٹال رہا ہوں“ دوسرے خط میں میجر صاحب کو عورتوں کے تذکرہ پر اشارے بتائے ہیں۔ مشہور شاعرہ خواتین کا ذکر ہے مثلاً گلبدن بیگم ہالیوں کی بہن، زیب النساء، سلیمہ سلطان بیگم، وغیرہ، کہ میجر صاحب ایک ایسا تذکرہ مرتب کرنے والے تھے اور آزاد سے کچھ مواد کے طالب تھے۔ آزاد لکھتے ہیں۔

”سلیمہ سلطان ہالیوں کی بھپی زاد بہن تھی۔ نہایت عالی فہم، لطیفہ گو، بذلہ سنچ، خوش تقریر، صاحب تدبیر، زیب النساء کی طرح وہ بھی مخفی تخلص کرتی تھی۔ تھی تو اتنی لائق مگر جہاں دیکھا اس کا ایک ہی شعر لکھا دیکھا۔ شعر

کا کلت رامن بہستی رشتہ جاں گفت۔ ام
مست بودم زین سبب حرف پریشاں گفتہ ام“
ایک خط میں آب حیات کی تعریف پر لکھتے ہیں۔

”جو کچھ آب حیات کے باب میں فرمایا ہے فقط قدر افزائی

ہے ورنہ من آنم کہ من دانم“

کسی خط میں اس مشکلی گھوڑے کا ذکر ہے جو سائیس لے کر بھاگ گیا تھا

پھر اپنے ایف، اے اور بی، اے کے کورس بنانے پر پکڑے جانے کا ماجرہ لکھا ہے۔ ان سے اردو اور فارسی نصاب مرتب کرنے کے باب میں رائے طلب لی گئی ہے اور ادھر ان کی ناگزیر عدیم الفرستی کا وہ عالم کہ دم لینے کی مہلت نہیں لکھتے ہیں۔

”مشکل یہ ہے کہ طبیعت محنت پسند واقع ہوئی ہے، جی چاہتا ہے ایسا انتخاب ہو کہ طلباء کے لیے اس کا مطالعہ مفید بھی ہو اور باعث دلچسپی بھی“

اس خط میں نیرنگ خیال اور آب حیات کو امتحان یونیورسٹی میں داخل کر لیے جانے پر جو اس کی مانگ بڑھ گئی ہے اس کا گلہ ہے۔ ان کتابوں کی اتنی قدر تھی کہ پہلی مرتبہ چھپیں ۱۸۸۳ء میں اور ۲-۲ ہزار جلدیں دیکھتے دیکھتے بک گئیں۔

ایک خط میں دربار اکبری کے لیے اپنی جگر کاوی اور انتہائی محنت کا ذکر کیا ہے، وہ بھی برسبیل تذکرہ، پھر لکھتے ہیں۔

”آب حیات نے تو مجھے ہلاک کر دیا۔ مجھ سے بیوقوفی ہوئی کہ

۱۰۔ مہینے کا کام تھا جو ۱۱ مہینے میں کیا“

ایک خط میں مہجر صاحب کو لکھا ہے۔

”آب حیات اور نیزنگ خیال سے چٹکارا ہوا تھا کہ اس سال یونیورسٹی مہربان ہوگئی۔ زبان اردو میں طلباء کے داخلہ کا ممتحن مقرر کر دیا اور زبان دانی میں اردو اور فارسی کا، ایک عربی کا حصہ بھی گلے کا ہار ہو گیا۔ ان کے سوالات بنانے ایسا وقت نہیں لیتے مگر کاغذات جو نمبر لگانے کو آئے ہیں وہ چھاتی پر پہاڑ ہیں۔ ۶۱۸ کاغذ اور آج سے صرف ۱۰ دن کی مہلت باقی ہے، مجھے صرف ۱۵۰ روپیہ کا اس میں فائدہ ہوگا، میں خدا گواہ ہے کہ اس پر خاک ڈالتا مگر صرف اس لیے منظور کیا کہ اس دفعہ کالج کا معاملہ نازک ہو رہا ہے، رجسٹرار ناراض ہو جائے گا تو لوگ مجھے احمق بنائیں گے اور کہیں گے کہ ڈاکٹر لائٹنر تو باسباب خاص ناراض ہو گئے اور ان کی ناراضی

لہ ڈاکٹر لائٹنر) (قسطنطنیہ میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم پائی اس

کے بعد انگلینڈ اور یورپ کے دوسرے ممالک میں ڈاکٹر کی ڈگری پائی، پنجاب ڈائریکٹر تعلیمات رہے، بعد میں مسلمان ہو گئے اور حیدر آباد دکن کے ایک نواب سے دو گنگ (میں مسجد بنوائی۔ جو اب بھی قائم ہے اور جس میں خواجہ

کمال الدین مرحوم نے انگلینڈ میں تبلیغ کا کام شروع کیا۔ (ملاحظہ ہو بقیعہ عاشیہ صفحہ ۳۵ پر)

بے شک تدارک پذیر نہ تھی، انھیں تو نے کیا سمجھ کر ناراض کر دیا۔
 ڈاکٹر لائٹ نے کئی دفعہ متعن کیا اور میں نے صاف انکار کر دیا۔
 خیر، انشاء اللہ ۱۰ روز میں یہ کام ختم ہو جائے گا، پھر دوبارہ اکبری
 ہے اور میں ہوں۔“
 اس خط کے خاتمہ پر لکھا ہے۔

”مجھے اکبری کی ایک تصویر ملتا تھا آئی کہ ۳۔۴ ترک عورتیں
 بیٹھی ہیں اور وہ دو تین برس کا بچہ بیچ میں کھیلتا پھرتا ہے،
 رات کا وقت ہے شمع دان روشن ہے۔ جھنجھو وغیرہ سامنے پڑے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۴) انھوں نے () میں () ()
 قائم کی جس میں اب تک یورپ کے بڑے بڑے مستشرقین علمی کاموں میں مشغول رہے
 ہیں۔ انھوں نے () سے ()

(
 نام کا ایک سہ ماہی رسالہ نکالا۔ جو اپنے وقت کا یورپ میں ایک زبردست علمی رسالہ
 مانا جاتا ہے اور اب بھی ”
 نام سے شائع ہوتا ہے۔

از ڈاکٹر مرزا ابوالفضل ام، اے۔ پی، ایچ، ڈی

یہ اکبر کے ابتدائی حالات میں لگانی واجب ہے، ایک ایسی ہی
پُرانی تصویر اور ملا دو پیازہ کی ٹلی ہے بیربل کے ساتھ اسے بھی
لگنا چاہیے۔“

ایک خط میں اپنی بوکھلاہٹ اور کس میرسی کا یوں نقشہ کھینچا ہے،
”برابر خطوط چلے آتے ہیں کہ فرائے دربار اکبری کا کیا
حال ہے، قندپارسی کا کیا حال ہے۔ لکچروں کا کیا حال ہے،
یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ آزاد کا کیا حال ہے۔“

پھر اب یہاں سے محمد دین صاحب کے نام خطوط شروع ہو جاتے ہیں۔
مگر ان میں کوئی ایسی خاص بات نہیں، صفحہ ۱۰۵ سے اپنے حبیب لیب
منشی ذکا و اللہ مرحوم کے نام خط ہیں، جو ان کے محرم راز تھے۔ یہ دو خط
بقول آغا محمد طاہر صاحب فقط مسودہ کر کے پھول گئے ہیں۔ روانہ نہیں
کئے اور یہ اس قابل بھی نہ تھے کہ مکتوبات کے ذیل میں آتے۔ حالت جذب
میں لکھے ہیں۔ جذبات و کیفیات کا بیان عجب مستانہ وار طریقہ پر کیا ہے،
ان میں تاریخ بھی نہیں لکھی، جگہ جگہ عبارت آرائی اور مناظر قدرت کا
لطف ملتا ہے، پھر قلم کا قدم جا بجا ڈگمگا جاتا ہے ”منشی من“ سے انھیں
مخاطب کیا ہے، اس خط کی ساری عبارت بے ڈھنگی، بے ربط و غیر مسلسل

ہے۔ کچھ کہنا چاہتے ہیں کچھ کہہ جاتے ہیں۔ چہل قدمی کا ذکر، رات کی ٹھنڈی ہواؤں کا بیان، تربوز کھانے سے بخار کا ہو جانا اور جوڑ جوڑ میں درد ہونا، ہوا خوری کی حد بابو راجس کی کوٹھی تھی۔ جس کے سو سو پھیرے ہوتے! میں ہوا خوری کا ذکر بڑا دلچسپ ہے۔

”حقیقت میں لطف عجیب حاصل ہوتا جاتا تھا، سینہ ہلکا ہوتا تھا، گھبراہٹ تھم جاتی تھی۔ جو ہڑکے کنارے پر پہنچے تو ہوا کی لہریں پانی سے مباحثے کر رہی تھیں شیشم کا ہر بھر دخت اس کی شادابی کا لطف، ٹھنڈی ہوا کی موجیں، حکم ہوا کہ یہاں رات کا سامان کر کے بیٹھو، دل بھوکا ہے، پیٹ بھوکا ہے۔ گھر اگر تعاضدائے شفقت سے صرف وہی چاٹ کر اور دیڑھ کباب سے منہ سلونا کر کے دسترخوان زیاد کیا۔

پھر کچھ ہلکی ہلکی باتیں ہیں، خاص الہامی رٹ ہے۔ جیسے کوئی طاقت ان پر حاوی ہے اور وہی لکھوا رہی ہے۔

دوسرے خط میں بھی وہی رنگ ہے، خاصی مجنونانہ باتیں ہیں مثلاً ہوا کھانے حسب معمول نکلے ہیں۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ایک مرد مقدس پر نیرنگا صورت، جنبہ پہنے ہیں، حاجیاں عرب کا عمامہ سر پر، ہزار دانہ کی تسیح

ہاتھ میں آہستہ آہستہ سڑک پر چلے جاتے ہیں۔ ان کے چہرہ کو سفید ڈاڑھی کے نور نے روشن کیا تھا جبہ کے سبز رنگ سے معلوم ہوتا تھا کہ حضرت خضر ہیں مگر عصا کہتا تھا کہ حضرت موسیٰ بھی ہیں۔ ان کی بات انکھوں نے مجھے متاثر کیا۔ میں نے مصافحہ کر کے ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور عرض کی کہ مجھ رو سیاہ کو کچھ نصیحت فرمائیں جو میرے کام آئے۔ وہ مسکرائے اور بول کیا کہ کیا قلم دوات تمہارے پاس ہے۔ میں نے عرض کیا کہ نہیں۔ مگر آپ جو کچھ فرماتے جائینگے صفحہ دل پر نقش کرتا جاؤں گا، فرمایا سنو، سب سے پہلی بات یہ کہ دنیا میں دوست تو کوئی ہے ہی نہیں۔ جو زیادہ دوستی برتے اسی کو دشمن سمجھنا۔ دشمن سے اسی دلفریب محبت برتو کہ دوستوں کی دوستی بھی نابود ہو جائے۔ آدمی ہو تو ابو بن جائے۔ غرض اسی قسم کی والہانہ باتیں کرتے کرتے خط ابھی ختم ہی نہ تھا کہ ختم ہو گیا۔

اب یہاں سے شاگردوں کے نام خط لکھے ہیں۔ پہلا خط لالہ ولی خانہ وکیل جگراؤں ضلع لدھیانہ کے نام ہے۔ یہ سسٹھ کے لکھے ہوئے خط تھا۔ ایک خط میں ان سے ایک بیج شکایت بھی کی ہے

”تم لاہور آئے اور مجھ سے بے لے چلے گئے، شاباش“

خدا تمہیں ایسا بڑا کرے کہ تجھے پوچان نہ سکوں“

اس میں جا بجا ابرو کی بیماری، ابرو کی طبیعت، چپک کا نکل آنا کھا
ہے۔ یہ ان کے فرزند محمد ابراہیم ہیں۔
ایک جگہ لالہ صاحب کو لکھے ہیں۔

”میرے گھر میں گلے کے درد سے بڑی تکلیف ہے میرے
بھی گلے میں درد ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ گرمی اور خشکی سے ہے
دودھ ملائی اور مکھن خاند کرتا ہے، واہ واہ بیماری بھی کیا
مزے کی ہوئی ہے۔“

بعض خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ نولنہ کے کئی بچے صغر سنی میں انتقال
کر گئے مثلاً

”صاحب کیا کہوں، پتھر کی چھاتی اور لوہے کا کلیجہ
کر لو تو جب میرے خط کو پڑھو اور مجھ سے خط و کتابت کرو۔
خلیفہ جی جب پورے تین مہینے کے ہوئے تو انھیں بھی ملاصاف
کے پہلو میں جا کر سلا آیا۔“

یہ سب لاڈ و پیار کے نام تھے، خلیفہ جی، ابرو وغیرہ۔
ناصر نذیر فراق کے نام ۵ خط ہیں۔ ایک خط میں دوسری شادی
کرنے پر لکھا ہے کہ

”ہلی بھی تو چپڑی اور دودو، بیوٹی بھی سیدانی، بُرا نہ
ماننا اب تمھاری دلی میں ذات و ات کا بالکل خیال نہیں کرتے۔
پیسہ کو دیکھتے ہیں“

دوسرے دو خط کچھ یوں ہی سے ہیں، ایک میں ان کا رسالہ ”سات طلائین“
پڑھ کر اس کی تعریف کے بل باندھے ہیں کہ

”اس کو پڑھ کر میرے پیٹ میں بل پڑ گئے، خدا کی پناہ
کس بلا کی پھوڑ اور گنگنی نفس، میں دیکھتا ہوں، تمھاری نثر
تمھاری نظم سے زیادہ مزیدار ہو چلی ہے خدا رکھے دلی کے
رہنے والے اور خواجہ میر درد کے نواسے تم سلیس اُردو نہ لکھو گے
تو اور کون لکھے گا۔ تمہارا یہ رسالہ اس قابل ہے کہ چھیوایا
جلئے اور لڑکیوں کو پڑھایا جائے، میں نے جا بجا اصلاح
دے دی ہے“

پھر ایک خط میں اپنے ضعف دماغ کی شکایت ہے۔
”ذات کو بالکل کچھ پڑھ نہیں سکتا۔ آزاد بڑھا ہو گیا
اور صد ماتِ زمانہ نے اس کو توڑ دیا، اپنے مسودے بستوں
میں بندھے پڑے ہیں دیکھتا ہوں اور ترستا ہوں“

پھر شاگردوں کے نام کچھ خط ہیں اور ایک ۹-۱۰ صفحے کا خط سرسید کو لکھا ہے، جس میں ان کی علمی خدمات اور سرگرمیوں کی پر جوش الفاظ میں تعریف کی ہے، اپنی خدمات کو جتایا ہے۔ سررشتہ تعلیم کی ابتدائی کتابوں کی وجہ تصنیف اور ان کی ترتیب میں جو زحمت و تکالیف برداشت کیے تھے ان کا ذکر ہے۔ پھیروں ہی مختلف دوستوں، شاگردوں کے نام ہوتے ہوئے ڈاکٹر لائٹنر پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور کے نام کوئی ۱۵-۱۶ خط ہیں، جن میں انھیں ”بندہ پرور“ سے مخاطب کیا ہے، پرنسپل صاحب نے لوگوں کی کہی سنی پر جو انھیں نقصان پہنچایا ہے اس کا شکوہ کیا ہے لکھتے ہیں۔

”اگر آپ دشمنوں کے ہاتھ سے مجھے خاک میں ملوا دیں گے تو مجھے افسوس نہیں۔ کیونکہ میرا فخر تنخواہ، کرسی اور عہدہ پر نہیں ہے۔ میں اسی خاک پر بیٹھا آپ کو دعائیں دوں گا اور دنیا کے پتوں پر وہ باتیں لکھ کر پھینکوں گا کہ جو پڑھے گا وہ افسوس کرے گا، میرے دل پر جتنے زخم لگے ہیں۔ مجھے عزیز ہیں کہ آپ کے لگائے ہوئے ہیں۔“

ایک خط میں زاید از نصاب تعلیم کے لیے اجازت لی ہے، کسی میں

رخصت اتفاقی کی درخواست ہے، یہ خطوط کا ذخیرہ طاہر صاحب نے بڑی محنت و کاوش سے اکٹھا کیا ہے۔

آخر میں انہوں نے وہ خطوط شامل کیے ہیں جو سرسید اور مولانا حالی نے آزاد کے نام لکھے ہیں۔ ایک نوٹ بھی دیا ہے کہ ”سرسید کے خط میاں باوا کے نام بہت ہیں۔ مگر افسوس تمام فارسی میں ہیں۔“ تین خط مولانا حالی نے لکھے ہیں۔ ایک خط میں مومن کی نسبت یوں رقم طراز ہیں:-

”سفیر ہند امرتسر میں جو مومن کا حال چھپا ہے وہ میں نے آج تک نہیں دیکھا، صرف منشی ذکا، اللہ کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ کسی شخص نے ایسا کچھ لکھا ہے۔ مگر دوسرے صاحب جو آپ پر بھی منہ آئے ہیں ان کا مضمون نواب احمد سعید خاں نے جو بہ تقریب رخصت تشریف لائے تھے، اخبار ”صبح صادق“ میں دکھایا تھا۔ یہ خیال اکثر حمقا کو ہے کہ آپ نے مذہبی تعصب کے سبب مومن کا حال نہیں لکھا، مگر اس سے بڑھ کر کوئی نحیف اور پوچ خیال نہیں ہو سکتا۔ شعر

دیا بوجہ خویش مویں دارو خس پندار دکہ این کشاکش بادست

آپ لوگوں کی یا وہ سرائی پر کچھ التفات نہ کیجیے۔ من ضعف قد
استہدف، خیال رکھیے اور اپنا کام کیے جائیے۔ نکتہ چینوں کے
خوف سے مفید کام بند نہیں کیے جاسکتے، اگر دو نکتہ چین ہیں تو
ہزار مداح و ثنا گو بھی تو ہیں۔“

آخر میں دو خط نواب علاء الدین صاحب علانی رئیس لوہارو اور
حافظ غلام رسول صاحب ویران کے ہیں، اول الذکر ادب کی وہ مایہ ناز
ہستی ہے، جس نے غالب کے دامن تربیت میں ہوش سنبھالا۔ دنیائے ادب
ان کے نام سے اس لیے ناواقف ہے کہ انھوں نے اپنی کوئی تصنیف نہیں
چھوڑی، مگر نظم و نثر میں مرزا غالب کے خلیفہ مانے جاتے تھے، فارسی اور اردو
دونوں زبانوں پر حاوی تھے۔

دوسرے حافظ صاحب ہیں جو ذوق مرحوم کے شاگرد تھے، نابینا تھے
مگر روشنی طبع سے حضرت ذوق، غالب، مومن، صہبائی کے معرکے اس طبع
بیان کرتے تھے کہ سما باندھ دیتے تھے، اس خط میں جو آزاد کے نام لکھا ہے،
غالب پر بر سے ہیں اور خوب بر سے ہیں۔ مثلاً

بہوں پاس آنکھ قبلہ حاجات چاہیے

”بہوں پاس کیا لفظ ہے اور قبلہ حاجات معشوق کو کہنا کیا ان کے والد تھے“

بس پھر اس کے بعد دو خط ادھر ادھر کے ہیں، جن کو یوں ہی اس
مجموعہ میں شریک کر لیا گیا ہے، خاتمہ پر ان اصحاب کا تھوڑا سا بیان ہے
جن کے نام آزاد مرحوم کے خط ہیں اور اس طرح یہ محنت ٹھکانے لگی ہے۔

فلسفہ الہیات | ۹۶ صفحات کی ایک تصنیف ہے جس میں اردو زبان
میں الہامی طرز بیان جلوہ گر ہے، مرحوم نے یہ کتاب عالم خود فراموشی میں
لکھی ہے چنانچہ ہر اس شخص کے لیے یہ کتاب ایک نعمت غیر مترقبہ ہے جو
دقیق النظر ہونے کے علاوہ نفسیات سے بھی کچھ لگاؤ رکھتا ہے، کیونکہ مولانا نے
اس کو کچھ اسی رنگ میں لکھا ہے، گویا یہ تمام عبارت کوئی دوسری قوت
لکھوا رہی ہے، وہ خود کچھ نہیں لکھتے۔

اس میں آپ مختلف باتیں دیکھیں گے۔ بعض عقائد کی بحثیں ہیں اور
عقلی نظریات جو مختلف زبانوں میں موجود تھیں ان کو مولانا نے آپس میں
متوازن کیا ہے۔ کچھ حصہ دعاؤں اور التجاؤں سے معمور ہے، طرز تحریر ایک
ہی ڈگر پر قائم نہیں، جلد جلد بدلتی ہے۔ ابتدا میں ذرا الجھن ہوتی ہے،
لیکن ایک نئی طرز کی اردو ہے جس کو ذرا غور سے پڑھنے کی ضرورت ہے،
ابتدائی دو صفحے بالکل مجذوب کی بڑ معلوم ہوتے ہیں، ان کو سمجھنا ذرا دشوار

ہے۔ تیسرے صفحہ پر نفس نامطقہ سے مخاطب ہیں اور گویا اس میں یہ ثابت کیا ہے کہ جو کچھ افعال انسان سے ظہور پذیر ہوتے ہیں ان سب کا فرماں روا "ایشور" ہے۔ اس میں انھوں نے خدا کو ایشور لکھا ہے۔

اس کتاب کے جتنے ابواب ہیں وہ باب نہیں کہلاتے بلکہ "ملاپ" سے معنون ہیں۔ مثلاً "فلسفہ الہیات" ، ملاپ پر محیط ہے۔

نفس نامطقہ کی تعریف کے بعد پہلا ملاپ ہے۔ اس میں ان چیزوں کا بیان ہے جنہیں ہم دیکھتے ہیں اور وہ ہیں۔ سوچتے ہیں اور پاتے ہیں مثلاً مادہ، صورت، شکل، سرد، جمال، عقل، وغیرہ۔ اس میں ان سب کی تشریح کی ہے، مگر ان کا سمجھنا ذرا مشکل ہے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور کہنا کیا چاہتے ہیں۔ دوسرے ملاپ میں ابتدا میں لکھا ہے

"یہ باتیں ہیں جن کو ہم نے دیکھا، ہم ہیں تو ہیں یہ باتیں آہم نہ ہوتے تو نہ ہوتیں۔ کیونکر؟"

ہے تو بڑے پتے کی باتیں لیکن عقل ان گتھیوں کو سلجھانے میں لاپتہ نہ ہو جائے تو معجزہ سمجھیے۔ اس میں عقل، نفس، حکمت، فلسفہ، قدرت، وغیرہ کی تشریح ہے، اس میں جا بجا ایشور لکھا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ بھاشا اور ہندی کا اثر جو ان پر تھا وہ غالب ہے اور حالتِ جذب میں دماغ پر

بہت حاوی ہو گیا ہے، بلکہ کتاب کے آخری صفحہ تک ایشور ہی الاپے جاتے ہیں، خداوند کریم کے واجب الوجود ہونے اور وحدت الوجود کا سرمایہ اس میں بھرتا ہے۔ تیسرا ملاپ ان چیزوں کے باب میں ہے جو ہم میں ہیں اور معلوم نہیں ہوتیں کہ کیونکر ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ میں تو سہی مگر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ہم میں کہاں ہیں۔ اس میں بڑی دلچسپ بحث چھیڑی ہے، مثلاً یہ کہ وہم ہم میں ہے۔ دھیان ہم میں ہے۔ قوت حافظہ ہے۔ مگر نہیں معلوم کہ یہ سب کہاں ہیں کیسے کہ دماغ میں ہیں یہ سب مگر وہاں تو نہیں پہلے پہل عقل پر بحث کی ہے اور اس کے بارہ اقسام بتائے ہیں، اس کے بعد حکمت پر خامہ آرائی ہے، اس میں منطقی دلائل و براہین سے گویا غالب کے اس فلسفہ کی تشریح کردی ہے۔ شعر

ہے پرے سرحد ادا رک سے اپنا مسجود قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما باندھتے ہیں
صبر، جبر و قہر، موت و حیات، سکوت و جمل، وغیرہ پر منطقی و الہامی بحث ہے۔ جس کے نکات سمجھنے سے ہم سطحی نظروالے معذور ہیں۔

چوتھے ملاپ میں ان چیزوں کا بیان ہے جو ہم سے الگ ہیں، اس میں بھی بعض بڑے پتے کی باتیں ہیں۔ مثلاً قسمت پر بحث ہے۔ لکھا ہے ”جو ہم سمجھتے ہیں تم نہیں سمجھتے، تم ہماری کی ہوئی قسمت“

خاموش کیوں ہوتے ہو، ایک ایک کے آگے زار نالی کرتے ہو،
 ہماری دی ہوئی چیز پر خوش رہنا۔“
 اس میں زیادہ تر مجذوبانہ رنگ جلوہ گر ہے، جس کو واقعی سمجھنے سے
 ہم قاصر ہمارا دماغ قاصر۔

پانچویں ملاپ میں عالم ناسوت کا بیان ہے اور اس نظریہ پر روشنی
 ڈالی ہے۔

”اللہ تعالیٰ انسان کے شہ رگ سے بھی قریب ہے“

پھر لکھتے ہیں

”ہم بہت دور ہیں اور اگر تم ہم میں ہو تو ہم سے زیادہ

کوئی پاس نہیں، ہم میں ہو تو ایسے ہو کہ ہم ہی ہوں، دوسرا
 خیال نہ ہو“

پھر عالم لاہوت کا بیان ہے، دھرم و ایمان کی منطق ہے، تاہم اکثر
 باتیں ایسی ہیں کہ ان کا مفہوم یا آپ وہ سمجھ سکتے ہیں یا خدا سمجھے۔

چھٹے ملاپ میں کتاب کے نام کی گویا وجہ تسمیہ ہے، یعنی الہیات پر
 خیالات بکھیرے ہیں۔ مثلاً یہ کہ

”ہم ہیں اپنے علم میں آپ علم، ہمیں کسی شے کی احتیاج

نہیں، ہر شے میں ہم موجود ہیں“
 یہ الہی باتیں الہی جانے، ہم آپ نہیں جان سکتے۔
 ساتویں ملاپ میں ان امور کی روداد لکھی ہے جو اس خمسے سے متعلق
 ہیں، یہ ملاپ دراصل حواس خمسہ کا ملاپ ہے۔ اس میں بڑی دلچسپ باتیں
 ہیں۔ جیسے

”ہم جب کسی چیز کو دیکھتے ہیں تو کیونکر دیکھتے ہیں انکھوں
 سے، جب ہم اسے سوچتے ہیں تو کیونکر عقل سے جب شے سمجھتے
 آتی ہے تو کیا ہوتی ہے، یہ ہے ہماری مرضی“
 غرض یہ اور اسی قسم کے دلچسپ سوال و جواب ہیں، اس کتاب کے آخر
 میں عبد المجید صاحب لاہوری کا ایک کتبہ درج ہے، جس کو اس کے متن سے
 بہت کچھ مناسبت ہے اور وہ یہ ہے :-

خود کو اتنا مٹا کہ تو نہ رہے تیری ہستی کا رنگ و بون نہ رہے
 ہو میں ایسا وصال پیدا کر کہ بجز ہو کے غیر ہو نہ رہے
رسالہ سپاک و نماک | یہ ۹۱ صفحے کا ایک رسالہ ہے، جس کو جناب
 مولوی میر ممتاز علی صاحب نے اپنے زیر اہتمام طبع کروایا تھا۔ اس کا سنہ
 اشاعت معلوم نہیں، پھر شایقین ادب کے پیہم تعاضدوں سے نفاذ ہوا ہے

نے دوبارہ اپنے زیرِ اہتمام ۱۹۲۷ء میں چھپوایا۔
یہ بھی مولنا آزاد کے زمانہ جنون کی تصنیف ہے، الہامی اردو کا ایک
بے مثل نمونہ۔

انھیں تصوف کا درس بچپن سے ازبر تھا۔ اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا
ہے کہ عالی دماغوں کی بیماری بھی دوسرے دماغوں کی بیماری سے مختلف ہوتی ہے۔
یہ کتاب کسی ایسے شخص کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے جس کو کسی نے مذہب
کا بانی ہونا چاہیے۔

دیوانِ ذوق | جس میں ملک الشعر ادا قانی ہند شیخ ابراہیم ذوق کا کلام
استاد کے قلمی مسودوں اپنی مختلف بیاضوں اور یادداشتوں سے جمع کیا ہے۔
سوانح عمری شروع کتاب میں ہے اور اکثر غزلیات و قصاید کے متعلق پچپ
نوٹ مولنا آزاد نے خود لکھے ہیں، ۱۰ ماہ کی لگاتار محنت کے بعد ان اوراق
پریشان کو مجتمع کیا ہے جو منتشر حالت میں سرگردان تھے، ایک بار کوہِ لوز کے
ایڈیٹر سے آزاد نے کہا

”میں نے اس دیوان کو ترتیب دینے میں بڑی محنت
کی ہے۔ ۱۰ ماہ دن رات آنکھوں کا تیل ٹپکا یا ہے۔ الزام یہ
ہے کہ میں خود غزلیں کہہ کر استاد کے نام سے شائع کرتا ہوں

اگر ایسا ہوتا تو خود اپنے نام سے شایع کرتا۔
 ذوق کے دیوان کا سارا سرمایہ غدر کی نذر ہو گیا۔ جس کو آزاد اور ذوق
 کے فرزند خلیفہ سمنیل نے ترتیب دیا تھا۔ تقریباً ۱۹۳۸ء میں ذوق کے ایک
 شاگرد حافظ غلام رسول ویران نے اپنے حافظہ اور احباب کی مدد سے ایک
 مجموعہ تمام غزلوں، متفرق اشعار اور چند قصیدوں کا پختہ کرکھا
 ذوق کا مختصر دیوان یہی ہے۔

نظم آزاد | آزاد کی چند ثنویاں جولاہور سکنا سبھا کے مشاعرہ میں
 پڑھی گئیں اور دیگر متفرق غزلیات، قصائد، اشعار، مباحثات و غنیمت
 رسالہ کی صورت میں اکٹھا کیے گئے۔ حسن و عشق کی قید سے آزاد، اخلاقی نظموں
 کا ایک پاکیزہ مرقع ہے۔ مغربی پھولوں سے مشرقی دامن کو سجایا ہے۔

نصیحت کا کرن پھول | تعلیم نسوان کی نسبت ایک نیاں بیوی کی
 دلچسپ بحث، آسان اردو زبان میں، لڑکیوں کے پڑھنے کے لیے مفید اور
 مناسب کتاب ہے، جس میں آسان سیدھے سادے فقرے روزمرہ کی بول
 چال اور لڑکیوں کی خاص دلچسپی کا سامان ہے۔

اخبار اتالیق پنجاب | اخبار اتالیق پنجاب ایک سرکاری اخبار تھا۔
 اور پنجاب میگزین۔ جس کے ایڈیٹر ماسٹر بیارے لال آشوب تھے۔

فخر صاحب پر تو آزاد کی قابلیت کا شکہ ہیٹھ ہی گیا تھا۔ جن کی توجہ سے ان کی
 اس ادنیٰ قدر ہونے لگی۔ اس کے بعد کرل ہال رائیڈ نے انھیں (۷۵) تنخواہ
 کرل ہال رائیڈ پنجاب کا سب ایڈیٹر بنا دیا، کچھ تو اس وجہ سے کہ اس اخبار
 کی سالانہ قیمت نسبتاً دوسرے اخبارات سے کم تھی کچھ اس لیے کہ یہ ایک سرکاری
 اخبار تھا اور زیادہ سے زیادہ اس سبب سے کہ ایڈیٹر و سب ایڈیٹر دونوں قابل
 یہ اخبار اتنا مقبول خاص و عام ہوا کہ اپنے ہم عصر اخباروں سے بازی لے گیا
 یوں بھی مضامین کی رنگینی و خوبی، عبارت کی برجستگی اور خوش اسلوبی نے اس کو
 ہر دل عزیز بنا دیا تھا اسی شاندار ہر دل عزیز کو دیکھ کر ہندوستانی اخباروں
 کے دل جذبہ رشک سے جل اٹھے اور ان سب نے گورنمنٹ سے درخواست
 کی کہ گورنمنٹ کا رعایا کے مقابلہ میں اخبار شائع کرنا درپردہ ملکی لوگوں کو
 نقصان پہنچانا ہے۔ گورنمنٹ نے اس معقول عذر کو تسلیم کر لیا، اخبار مذکور
 کی بجائے ایک رسالہ پنجاب میگزین کے نام سے جاری کر دیا۔ حضرت آزاد کے
 بعد تیب وہ پروفیسر ہو گئے تو خواجہ خالی نے بھی کچھ دنوں اتالیق پنجاب
 کی سب ایڈیٹری کا کام انجام دیا تھا۔

در اصل یہ سب ایڈیٹری نہ تھی بلکہ یہ دونوں صاحب ان مضامین کی
 جو انگریزی سے ترجمہ کیے جاتے تھے۔ زبان کی اصلاح و درستی برامور تھے۔

آزاد کی شاعری

اگر اس مقولہ میں کچھ صداقت ہے کہ ”ہر شاعر موزوں طبع نہیں ہوتا اور ہر موزوں طبع شاعر نہیں ہو سکتا۔“ تو آزاد کی گئی گزری شاعری پر بھی ایمان لانا پڑتا ہے، وہ صرف نثر میں ہی شاعری نہیں کرتے تھے بلکہ وہ خود شاعر بھی تھے۔ اس طرح وہ نظم و نثر دونوں اصناف کلام پر حاوی تھے، انھوں نے آنکھ کھولتے ہی ذوق کو دیکھا اور یقیناً ان کی صحبت میں انھوں نے بیکار وقت نہیں گزارا۔ شاعر کی صحبت اور انسان، پھر شاعرانہ طبیعت کا انسان اور شاعر بننے۔ آزاد خود اپنی واردات شاعری دیوان ذوق کے دیباچہ میں یوں لکھتے ہیں:-

”استاد ذوق ایک دن بادشاہ کی غزل کہہ رہے تھے، تیر ہمیشہ، تصویر ہمیشہ، سوچتے سوچتے کہنے لگے، تم بھی تو کچھ کہو، میں نے کہا کیا عرض کروں۔ فرمایا، میاں! اسی طرح آتا ہے۔ ہوں ہاں، غوں غاں کچھ تو کہو، کوئی مصرعہ ہی سہی

میں نے کہا ع

سینہ سے لگائے تیری تصویر ہمیشہ

ذرا تال کر کے کہا۔ ہاں درست ہے، شعر

آجائے اگر ہاتھ تو کیا چین سے بھی سینہ سے لگائے تیری تصویر ہمیشہ“

آزاد کا یہ سب سے پہلا شعر ہے۔

آزاد فطری، شاعر تھے اور ازل سے شاعرانہ طبیعت کے مالک تھے جس کی

نثر شاعرانہ لطافتوں کی تشبیہ و استعاروں کے ہنگاموں سے مالا مال ہو اس کو شاعر نہ کہنا خود شاعری ہے۔

استاد ذوق سے نوجوان آزاد کو بڑی حسن عقیدت تھی۔ انھیں کے فیض

صحبت اور حسن تربیت نے آزاد کے حساس دل میں جذبہ شاعری کی لہر دوڑادی،

وہ نہ صرف ان کی شاعرانہ صحبتوں سے ہی لطف اندوز ہوئے بلکہ انھیں کی صحبت

میں دلی کے بڑے بڑے مشاعروں میں شریک ہونے تھے جہاں مشہور اساتذہ فن

سے شناسائی کے علاوہ ان کے کلام کے حسن و قبح سے بھی بخوبی مستفید ہوتے جلتے

تھے۔ ذوق کی وفات کے بعد وہ حکیم آغا جان عیش سے اصلاح لینے لگے اور

اپنا کلام دلی کے مشاعروں میں سنانے لگے۔ کہتے ہیں کہ ان کا اس زمانہ کا کلام

غدر کے نذر ہو گیا۔

آزاد کا رتبہ اُردو شاعری میں وہی ہے جو اسکاٹ کا انگریزی شاعری میں، کسی نئے خیال کے پیدا کرنے والے اور کسی نئی تحریک کے بانی کو دنیا جبرِ قہر کی نظر سے دیکھ سکتی ہے آزاد بھی اس کے پوری طرح مستحق ہیں۔ قدیم شاعری کی اصلاح کا انھوں نے ہی سب سے پہلے بیڑا اٹھایا اور جدید شاعری کا تخم بویا۔ دنیائے ادب انھیں کی بدولت نچرل شاعری کے اصل مفہوم سے آشنا ہوئی۔ کیفی دہلوی فشورات میں لکھتے ہیں۔

”اگر امیر خسرو نے اُردو کا پہلا شعر موزوں کیا، اگر ولی نے پہلا دیوان اُردو نظم کا مرتب کیا، اگر بیجو باورے نے پہلا دھڑیل ہندی زبانوں میں باندھا، اگر رودکی نے پہلا شعر فارسی کا کہا تو حضرت آزاد نے پہلی نظم نئی طرز کی موزوں فرمائی۔“

ان کی شاعری جو ان کے نثر کے مقابلہ میں بھیک کی معلوم ہوتی ہے اس کا سبب یہی ہے کہ آزاد بہ نسبت نظم کے نثر کی طرف زیادہ مایل تھے، ان کے تخلص کا اثر ان کے کا ناموں سے صاف عیاں ہے، وہ نظم کی محدود بندھی بندھائی ردیف قافیہ کی نشست سے آزاد ہو کر نثر کی دنیا میں اپنے بے پناہ تخیل کا سرمایہ منتشر کرنا چاہتے تھے۔ ان کے خیالات نظم کی محدود بندشوں سے آزاد رہنے، تلمذ، رتلمذ، مناظرت کا حسن جسے کسی ایک کے لیے مخصوص نہیں

رہتا جس طرح قدرت کی فیاضیاں دعوت عام دیتی رہتی ہیں اسی طرح آزاد نگہی
نشر کی دنیا میں آکر خیالات کی آزادی چاہتے تھے۔ جہاں تک ان کا کلام ہے
اس میں بھی ایک فطری حسن کار فرما ہے۔

میر حسن، نظیر اکبر آبادی اور میر انیس کے بعد آزاد اردو کے سب سے بڑے
منظر نگار شاعر ہیں، ان کی شاعری فلسفیانہ عمق سے پرے ہوئی ہوئی ہے۔ لیکن
لفظی شان و شوکت جیسے کہ آزاد کی شاعری میں ہے، سودا کے بعد کسی شاعر
کے کلام میں نہیں مل سکتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ سودا کا اثر ذوق کی شاعری خصوصاً
قصیدہ نگاری کے توسط سے آزاد پر بہت بڑا تھا۔ آزاد نشر کی طرح نظم میں بھی
حسن لفظی کے پابند ہیں۔ وہ اپنے ماحول سے متاثر ہو کر اپنے خیالات کا اظہار
بڑے جمل طریقے سے کرتے ہیں۔ ان کی بعض مثنویوں میں ایسے کئی کلمے ملتے ہیں
جن میں آزاد منظر نگاری کی تہہ تک پہنچ گئے ہیں۔ اس خصوص میں آزاد کی
شاعری، اسالیب کے اعتبار سے نظیر اکبر آبادی سے بہت متاثر معلوم ہوتی ہے۔
مگر فرق دونوں میں اتنا ہے کہ نظیر نصب العینیت کی طرف زیادہ مایل ہیں اور
آزاد اپنے گرد و پیش سے حقائق کا انتخاب کرتے ہیں۔

ان کی جدید شاعری کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم نچرل شاعری ہے اور دوسری
قسم اپنے اندر وہ غیر معمولی اضطراب و ہیجان رکھتی ہے جو کسی عجائب خانہ پر

پہنچنے کے بعد اس سیاح اور تماشا فاشی سے ظاہر ہوتے ہیں جس کو یقین ہو کہ وقت کم ہے۔ پاؤں میں چلنے پھرنے کی سکت باقی نہیں اور بہت سی چیزیں قابل دیدنی جاتی ہیں۔ اسی دوسری قسم کے اندر ان کا شہ کار ”خسرو امن کا دربار“ بھی داخل ہے۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے جس کو تسلیم کرنے سے کس کا فرو پس و پیش ہو سکتا ہے کہ آزاد و مجاہد دوم کے معمولی شاعر ہیں۔ چنانچہ اسی لیے ان کی ان نظموں میں کامیابی کی جستجو ان شاعرانہ قوتوں سے باہر کرنی چاہیے۔ جو یقیناً ان کی طبعی مناسبت کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتیں۔ مثلاً اسی مثنوی خواب امن میں ”خسرو امن کا دربار“ انہوں نے اس طرح سنوارا ہے، نیز اس میں یہ بتلایا ہے کہ ہر قسم کی تمدنی ترقیاں کسی ملک میں صرف امن ہی کی صورت میں ہو سکتی ہیں۔

شعر

میں کہ آشوب جہاں سے تھا اتم دیدہ بہت	امن کو سمجھا غنیمت دل غم دیدہ بہت
شوق دل لے کے غرض قصر میں آیا مجھ کو	پر عجب عالم نیز گنگ دکھایا مجھ کو
خسرو امن تھا واں جلوہ فرائے دربار	دیتی فرحت تھی دل و جان کو ہوائے دربار
صبح دن رات کھڑی سامنے منہ تھی	نور کے ساتھ سدا اوس برتی تھی وہاں

دل میں انکار پریشاں کا نہ تھا نام وہاں

ہاتھ جمعیت خاطر کے تھے سب کام وہاں

صداقت، جوش اور سادگی اصلی معنوں میں شاعری کے اجزائے ترکیبی ہیں، جن کی بحیثیت ایک شاعر آزاد کی شاعری بھی مستثنیٰ نہیں۔ یہ قلمی اُردو شاعری میں ایک ممتاز درجہ رکھتی ہے، اس میں استعارے کے پیرایہ میں انہوں نے امن امان کے فوائد بیان کیے ہیں۔ یہ آزاد کا خاص اسلوب تھا۔ ان کے بہترین نثری کارنامہ ”نیزنگ خیال“ کی طرح ”خواب امن“ ایک مخصوص کارنامہ ہے، آزاد کا تخیل اس نظم میں بہت ہی بلند ہو گیا ہے، بھرتی کے شعر اس نظم میں بہ نسبت دوسری نظموں کے بہت کم ہیں۔ الفاظ کی نشست، استعاروں کی خوبی اور لطافت کے اعتبار سے یہ نظم آزاد کی مخصوص ذہنیت اور ان کے آرٹ کا منہا ہے۔ اس طرح کی نظم لکھنا آسان کام نہیں۔ کیونکہ شاعر کو استعارے کے نبھانے میں مٹی و قلموں کا سامنا ہوتا ہے اور جب وہ سرانجام پاتی ہے تو دلچسپیوں کا ایک مرقع بن جاتی ہے۔

”شب نقد“ اور ”صبح امید“ بھی آزاد کی اچھی قمنویاں ہیں لیکن ان میں اول تو آزاد کے اسلوب کی بہت کم خصوصیات موجود ہیں۔ دوسرے جزو اور صفائی ”خواب امن“ میں ہے وہ ان میں مفقود ہے۔ ”صبح امید“ میں نہایت موثر طریقہ سے دکھلایا ہے کہ مختلف کاروبارِ عالم، مثلاً زراعت، تجارت، ملک گیری، تعلیم وغیرہ میں امید ہی کار فرما ہے۔ دنیا امیدوں کی

جولگانہ ہے اور اسی بنیاد پر قائم رہے گی۔

”شبنوی ابرکرم“ میں ہندوستان کے موسم بہار یعنی برسات کا سماں
باندھا ہے۔ یہ نظم حالی کی ”برکھارت“ کے طرز پر ہے۔

”گنج قناعت“ و دایۃ انصاف، داد انصاف“ میں بھی آزاد نے اسی
قسم کے استعاروں سے کام لیا ہے۔ لیکن ان میں وہ چستی و بندش محفل ہے۔
آزاد کی شاعری اصلاحی پر وگنڈے سے پاک ہے، انھوں نے اپنی
شاعری کو اصلاح کا براہ راست ذریعہ نہیں بنایا۔ بلکہ اپنی تقریریں
انھوں نے یہ کام لیا ہے۔

”وہ چیز جو آزاد کے کلام میں خاص طور پر ماہہ الامتیاز ہے وہ یہ ہے کہ
ان کی جدید شاعری کا مطلع نظر ہمیشہ ایک رہا۔ ان کی رائے میں حالی، شبلی
وغیرہ کی طرح کبھی تذبذب نہیں پیدا ہوا“ آزاد کے نقطہ خیال سے شعر کا جو معیار
تھا اس کو انھوں نے اپنی تقریر میں اس طرح ظاہر کیا ہے:-

”اگر کوئی کلام منظوم تو ہو، لیکن اٹسے خالی ہو تو وہ

نہ وہ تقریریں ملاحظہ ہوں جو نظم آزاد کے ساتھ شائع ہوتی ہیں۔

تھے جدید اردو شاعری (صفحہ ۱۸)

”نظم آزاد“ نظم اور کلام کے باب میں خیالات۔

ایک ایسا کھانا ہے کہ جس میں کوئی مزا نہیں۔ ”کھٹانہ میٹھا جیسا کہ
شعر کسی استاد کا ہے۔ شعر

دندان تو جملہ دروہا نسند چشماں تو زیر ابرو انا نسند
نظم و حقیقت ایک شاخ گلرئز فصاحت کی ہے جس طرح پھولوں
کے رنگت بوسے داغ جسمانی تروتازہ ہو جاتا ہے شعر سے روح تروتا
تازہ ہوتی ہے۔ پھولوں کی بوسے مختلف خوشبوئیں محسوس دماغ
ہوتی ہیں۔ کسی کی بوتیز ہوتی ہے۔ کسی کی بو مست ہے۔ کسی کی بو
نفاست و لطافت ہے۔ کسی میں سہانا پن، اسی طرح مضامین
اشعار کا بھی یہی حال ہے۔ جس طرح پھول کہ کبھی چین میں، کبھی
ہار میں، کبھی عطر کھج کر، کبھی عرق میں جا کر، کبھی دودھ سے کبھی
پس سے اس کی مختلف کیفیتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اسی طرح مضامین
شعری مختلف حالتوں اور مختلف عبارتوں میں رنگارنگ کی
کیفیتیں عیاں کرتے ہیں۔“

یہی ہے آواز اولیٰ شاعری اور یہی ہے ان کا طریقہ بیان، اس بلندی
تخیل کے زینہ سے آزاد اپنے شعری نصب العین کی چوٹی پر پہنچ جاتے ہیں۔
اپنی اسی تقریر میں انھوں نے شعر کے ساتھ رفعت خیال اور تاثیر معنوی کو بھی

متعلق کیلئے۔ یہ آزاد کا میدان نہیں تھا۔ جہاں کہیں بھی انہوں نے بلند پروازی اور فلسفیانہ غور و خوض کی کوشش کی ہے انھیں ناکامی کا سامنا ہوا ہے۔

آزاد کی شاعری مر جھائے ہوئے قلب اور پژمرده احساسات کے لیے طل بہلانی کے اسباب پیدا کر سکتی ہے۔ ”دامن دل سے گرد افکار“ کو دھو سکتی ہے۔ لیکن ”خیال کو عروج اور ذہن کو قوت پرواز“ عطا نہیں کر سکتی شاعر بالعموم دو مصرعوں میں اچھا خاصا افسانہ بیان کر دیتا ہے۔ ایک اچھا شعر دل پر وہ قیامت برپا کرتا ہے، جو دفتر کے دفتر نہیں کر سکتے۔ شاعر احساس انسانی کا واحد ترجمان ہوتا ہے۔ بعض اشعار محض الفاظ کا طلسم ہوتے ہیں، جن میں گفتگی، رعنائی، لطافت، ترنم اور تشبیہ و استعاروں کی ایک دنیا ہوتی ہے۔ پس آزاد کی شاعری بھی اسی کتب خیال کی پیروی ہے۔

تصنیف کے آزاد | آزاد اس زمانہ میں پیدا ہوئے جب کہ ایک دور کا
تصویر کے آزاد | چراغ گل ہو رہا تھا اور دوسرے دور کا افتاب

طلوع ہو رہا تھا، نئے رجحانات، نئے ولولے، نئی انگلیں، نئے جذبات دل میں موجزن نئی اسپرٹ ان کے رگ وریشے میں سرایت کر چکی تھی۔ کتاب بھی لکھیں تو نئی طرز، نیا اسلوب، نیا انداز بیان، نئی وضع، نئی نئی ترکیبیں ان میں نگینوں کی طرح جڑ دیں، ان کے کلام و بیان کی نازک خیالیاں، لطایف

وظرائف کی جدت طرازیں تشبیہ و استعاروں کے کہنے سے بچی ہوئی زبان، خیالات میں وہ روانی اور سریلاراگ جو پڑھنے والے کو ایک لافانی سکون سے دوچار کر دے۔ الفاظ کی خوبصورت حسین ترکیبوں اور بندشوں میں ابدی زندگی کا احساس ہونے لگے حقیقت میں آزادانہ ادب کی زبان کا ذائقہ ہی بدل دیا۔ ہم ان کو ایک نئی دنیا کا انسان کیونکر نہ سمجھیں۔ ان کی ساری کتابیں جدید طرز کی لکھی ہوئی ہیں جن کو پڑھ کر تخیل پر ایک وجدانی کیف طاری ہو جاتا ہے۔ جیسے بہار کی قوس و قزح میں دل جھولا جھول رہا ہے علم و فضل کا ایک بے پناہ ہمندرجس کے عشق کی خبر اس کے الفاظ کی جادو بیانی میں گم ہو جانے کے بعد ملتی ہے تقریر کی دلکشی میں موہ لینے کی وہ بے پناہ قوت جس کو صرف لینے والوں کا ہی دل جانتا ہے۔ اقلیم ادب کا یہ شہنشاہ جس نے ادب جدید کی روح پر ایک سنسنی خیز کار فرمائی کی۔ ساجی نبض کو جس نے خسیس کیا۔ جس کے ادبی شہکاروں میں قوم کے دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے جس نے جو کچھ بھی کہہ دیا وہ اب تک ادب و انشا کے ماتھے پر افشان کا کام کر رہا ہے۔ اسی آزاد کو پڑھ لینے کے بعد جب ہم تصویر کے پردہ پر دیکھتے ہیں تو اس کو ایک مولویانہ طرز کا علامہ سمجھنے لگتے ہیں۔ تخیل کے پس منظر نے جو آزاد کی تصویر بنائی تھی وہ اس آزاد سے کتنی مختلف معلوم ہوتی ہے تصویر دیکھ کر

تعب ہوتا ہے کہ اسی قدامت پسند وضع قطع کے آزاد نے نیچرل یا نئی شاعری کی نیوڈالی تھی۔ ان کی تصانیف کو دیکھنے کے بعد تخیل ایک ایسی تصویر بنا رہا تھا جس پر نازک خیالیاں ختم تھیں۔ مثلاً یہ کہ یہ کس قسم کا انسان ہوگا جس کا ایسا دل و دماغ تھا۔ خیالات کی بے پناہ موجیں جو عقد ثریا سے جا ملتی تھیں تصویر دیکھ کر اپنا سامنہ لیے رہ گئیں۔ یہ تصویر تو وہ ہے جو ان کی تصویر کو دیکھے بغیر تصور کی آنکھوں نے پیدا کی تھی۔ ہمارا تخیل ان کی جہانی ساخت سے بالکل ایک علیحدہ ڈھانچہ تیار کر چکا تھا۔ ان کے چوڑے پچھلے ہاڑے بڑے بڑے ہاتھ پاؤں دیکھ کر ان کی وسعت بیان کا اندازہ لگ جاتا تھا مگر مزاج کی رنگینی اور زور بیان کی شگفتگی کسی پہلو سے نمایاں نہ ہوتی تھی۔ وضع و قطع سب مولویانہ وہی مولویوں کا سا صاف، ریش منقطع و تراشیدہ۔ لباس میں وضع و لدی، لٹھے کا ڈھیلا ڈھالا چھ۔ غرض ایک بنے بنائے مولوی تصویر میں بڑے رب و متانت سے کھڑے ہیں۔

آزاد کا پیرائہ تنقید

(۱۰)

اسلامی لٹریچر میں شاید کوئی شاعر یا ادیب ایسا گذرا ہو گا جس کی تصنیفات پر موافق حال حق بجانب تنقید کی گئی ہو۔ یہ انا کہ تنقید ہی اصلاح کا ایک تیر بہدف پیرایہ ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ فی زمانہ ہمارے نظریات بدلتے جاؤں۔ ہم آرٹ اور سن کو اپنی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کریں۔ آزاد کی دیوانگی تک اگر ہم اس کے معیار کو جانچنے لگیں تو دنیا پچاس برس دور نکل آئی ہے، جو نظریات ان لوگوں نے بنائے تھے انشا اور ادب کا اس گئے گزرے زمانہ میں جو رنگ ڈھنگ تھا اس پر موجود دور نے اپنی ممکنہ حد تک رنگ و روغن چڑھایا ہے۔ زبان کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس کو کھینچ کھینچ کر آسمان و زمین کے قلابے ملائے گئے ہیں۔ اس کا یہی تو امکان ہے کہ آج جس انشا پردازی کو ہم تصنع و بناوٹ سے معنون کہتے ہیں کل ہمارے ادب پر، ہماری زبان پر بھی خشکی، غیر دلچسپی و بے کیفی کا فتویٰ لگ جائے۔ اگر ہم عہد گذشتہ کی تصانیف پر

اپنی نظریات کی روشنی میں تنقید کریں گے تو ہم کبھی بھی کوئی معقول نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے۔ ہمارا یہ طرزِ عمل نا انصافی پر مبنی ہوگا۔

شیکسپیر کے متعلق اب تک یہ بدگمانی ہے کہ شیکسپیر بالکل جاہل تھا وہ محض ایک اداکار تھا اور بس۔ اس کے جتنے کارنامے ہیں وہ سب اس کے دوست بیکن کی ذہنی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ مگر یہ سب خیالات ہی خیالات ہیں۔ ان کو دنیا کے ادب اب تک تحقیقی طور پر ثابت کرنے سے قاصر ہے۔

یہ ہماری ستم ظریفی نہیں تو کیا ہے کہ جب ہم کسی کے مخصوص طرز کی نقل نہیں کر سکتے تو اس کو غیر سنجیدہ بے تحقیق کہہ کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں۔ اس میں اس طرز کی خرابی نہیں ہے بلکہ یہ ہماری عدم قابلیت کا ثبوت ہے اور اپنی بیچارگی کا اعتراف، بقول حفیظ نعیمی

”مولنا شبلی جن کے متعلق خود ان کا مداح یہ لکھے کہ ”وہ

معاصرانہ کمالات کے اعتراف میں فیاض نہیں تھے“ وہی شبلی

جس کے کمالات کا نہایت دریا دلی کے ساتھ اعتراف کریں تو

اس کے کمال میں کس کا فر کو شبہ ہو سکتا ہے“

ایک دوسری جگہ شبلی نے آزاد کی ساحرانہ انشا پر داذی کا ایک اور انداز

سے اعتراف کیا ہے۔ مہدی الافادی کو خط میں لکھتے ہیں :-

”آزاد کی کتاب آئی۔ جانتا تھا کہ وہ تحقیق کے میدان کا
مرد نہیں۔ تاہم ادھر ادھر کی گلیں بھی ہانک دیتا تو وحی معلوم ہوتی
یران ہوں کہ جس کو شئی ”تحقیق کے میدان کا مرد نہیں“ لکھتے ہیں اسی کے منہ
بولا نا حالی اسی کی نسبت یہ فرماتے ہیں۔ شعر

لکوں میں پھر امد توں تحقیق کی خاطر چھوڑا نہ دقیقہ بھی کوئی رنج و تعب کا
دیکھا نہ سنا ایسا کہیں اہل قلم میں تصنیف کا تدوین کا تحقیق کا لپکا
یہ عجیب دنیا ہے، یہاں جو بلا تحقیق دوسروں کے خیالات پر اپنے خیالات

کے حاشیے چڑھاتا ہے اس کے بیان میں ضرور تحقیق پائی جاتی ہے اور جو خود تحقیق
میں سرگرم رہ کر اپنی کاوشوں سے کوئی نئی بات پیدا کرتا ہے۔ جس میں کچھ نہ کچھ
فرق ہوتا ہے جس کی باتوں میں بلاشبہ انوکھا پن اور جدت ہوتی ہے۔ وہ
آنکھوں میں کھٹکنے لگتی ہے اور دوستوں کو اعتراض کرنے کے لیے کافی میدان
ملتا ہے، غرض کہنے کو مخالف اور موافق بہت کچھ کہا جاسکتا ہے لیکن جو انصاف
پسند طبیعتیں ہیں وہ ہمدی الافادی کے اس منصفانہ فیصلہ کی ضرورتاً مدد کریں گی۔

”آزاد کی ادبی فتوحات تاریخ لٹریچر کا ایک واقعہ ہے جس کا

فیصلہ خود فلسفہ ادب کے ہاتھوں ہوگا اور پروفیسر آزاد کا درجہ

بہ حیثیت ادیب جو کچھ ہے اس کا سمجھنا دوم درجہ کی خلقت

اپنی نظریات کی روشنی میں تنقید کرینگے تو ہم کبھی بھی کوئی معقول نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے۔ ہمارا یہ طرزِ عمل نا انصافی پر مبنی ہوگا۔

ٹیکسپیر کے متعلق اب تک یہ بدگمانی ہے کہ شیکسپیر بالکل جاہل تھا وہ محض ایک اداکار تھا اور بس۔ اس کے جتنے کارنامے ہیں وہ سب اس کے دوست بیکن کی ذہنی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ مگر یہ سب خیالات ہی خیالات ہیں۔ ان کو دینا اے ادب اب تک تحقیقی طور پر ثابت کرنے سے قاصر ہے۔

یہ ہماری ستم ظریفی نہیں تو کیا ہے کہ جب ہم کسی کے مخصوص طرز کی نقل نہیں کر سکتے تو اس کو غیر سنجیدہ بے تحقیق کہہ کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں۔ اس میں اس طرز کی خرابی نہیں ہے بلکہ یہ ہماری عدم قابلیت کا ثبوت ہے اور اپنی بیچارگی کا اعتراف، بقول حفیظ نعیمی

”مولانا شبلی جن کے متعلق خود ان کا مداح یہ لکھے کہ ”وہ

معاصرانہ کمالات کے اعتراف میں فیاض نہیں تھے“ وہی شبلی

جس کے کمالات کا نہایت دریا دلی کے ساتھ اعتراف کریں تو

اس کے کمال میں کس کا فر کو شبہ ہو سکتا ہے؟

ایک دوسری جگہ شبلی نے آزاد کی ساحرانہ انشا پر دازی کا ایک اور انداز

سے اعتراف کیا ہے۔ جہدی الافادی کو خط میں لکھتے ہیں :-

”آزاد کی کتاب آئی۔ جانتا تھا کہ وہ تحقیق کے میدان کا
مرد نہیں۔ تاہم ادھر ادھر کی گپیں بھی ہانک دیتا تو وحی معلوم تھی“
حیران ہوں کہ جس کوشلی ”تحقیق کے میدان کا مرد نہیں“ لکھتے ہیں اسی کے مرتے
مولانا حالی اسی کی نسبت یہ فرماتے ہیں۔ شعر

ملکوں میں پھر ادھ توں تحقیق کی خاطر چھوڑا نہ دقیقہ بھی کوئی رنج و تعصب کا
دیکھا نہ سنا ایسا کہیں اہل قلم میں تصنیف کا تدوین کا تحقیق کا لیکا

یہ عجیب دنیا ہے، یہاں جو بلا تحقیق دوسروں کے خیالات پر اپنے خیالات
کے حاشیے چڑھاتا ہے اس کے بیان میں ضرور تحقیق پائی جاتی ہے اور جو خود تحقیق
میں سرگرم رہ کر اپنی کاوشوں سے کوئی نئی بات پیدا کرتا ہے۔ جس میں کچھ نہ کچھ
فرق ہوتا ہے جس کی باتوں میں بلاشبہ انوکھا پن اور جدت ہوتی ہے۔ وہ
آنکھوں میں کھٹکنے لگتی ہے اور دوستوں کو اعتراض کرنے کے لیے کافی میدان
ملتا ہے، غرض کہنے کو مخالف اور موافق بہت کچھ کہا جاسکتا ہے لیکن جو انصاف
پسند طبیعتیں ہیں وہ ہمدی الافادی کے اس منصفانہ فیصلہ کی ضرورتاً یاد کریں گی۔

”آزاد کی ادبی فتوحات تاریخ لٹریچر کا ایک واقعہ ہے جس کا
فیصلہ خود فلسفہ ادب کے ہاتھوں ہوگا اور پروفیسر آزاد کا درجہ
بحیثیت ادیب جو کچھ ہے اس کا سمجھنا دوم درجہ کی خلقت

کے لیے جو فلسفہ لٹریچر سے قطعاً بیگانہ ہے آسان نہیں ہے۔“
یہ ثابت ہو چکا کہ آزاد زبان اردو کے مسلم الثبوت استاد ہیں۔ مولانا
حالی ان کا کلمہ پڑھتے رہے، مولانا شبلی نے ”خداۓ سخن“ کہہ کر پکارا، نذیر احمد
ذکا، اللہ وغیرہ نے ان کی زبان کی خوبیوں کو بار بار سراہا، وہ اپنے وقت کے ایک
عظیم المثال نثر، جادو بیان، انشا پرداز ہی نہیں بلکہ ایک زیر دست نقاد بھی
سمجھے جاتے تھے اور ایک عرصے تک اس میدان کے وہ تنہا شہسوار تھے لیکن جوں
جوں زمانہ گزرتا گیا ان کی ناقدانہ حیثیت میں فرق آتا گیا۔ یہاں تک کہ لوگوں
نے کھلم کھلا انھیں مورخ یا نقاد کہنے سے انکار کر دیا۔ ہاں ان کے سحر کا قلم کا
طلسم ہو شر باقی ہے۔ وہ کسی سے نہ ٹوٹ سکا، نہ ٹوٹ سکتا ہے، نہ ٹوٹے گا۔
چنانچہ شعر الہند اور گلِ رعنا کے مصنف باوجود انھیں ایک غلط بیان مورخ سمجھنے
کے لکھتے ہیں کہ جو واقعات آزاد نے بیان کر دیے ہیں اگر ہم ان کے خلاف
سندیں بھی پیش کریں تو کوئی یقین نہیں کر سکتا۔ رام بابو سکسینہ آب حیات کی
تنقید کی نسبت لکھتے ہیں۔

”د افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مولانا نے اپنے جوش و شوق میں
تاریخی مواد کو غور و خوض سے نہیں دیکھا۔ غیر مشوق اور غیر معتبر حوالہ
کی بنیاد پر سر بفلک عمارتیں کھڑی کر دی ہیں اور بعض جگہ لمبھی

پیدا کرنے کے لیے واقعات میں کمی بیشی اور تبدیلی دمک کو جائز رکھا ہے، اکثر جبکہ جانب داری کا الزام بھی مصنف پر عاید ہوتا ہے۔ آزاد کے متعلق نواب صدر یا جنگ بہادر ارقام فرماتے ہیں:-

”یہ امر میرے نزدیک مسلم ہے کہ بیان واقعات میں سخت بے احتیاط ہیں، بلکہ ضرورت کے وقت واقعات تراشتے ہیں اور اپنی دل فریب طرز سے دل نشین کر دیتے ہیں۔ جس قدر لٹریچر شائع ہوتا جاتا ہے ان کا یہ پہلو سامنے آ کر نمایاں اور آشکارا ہوتا جاتا ہے۔ مثلاً میر کے متعلق اور ان کے تذکرے کے متعلق آب حیات کا بیان پڑھو، پھر تذکرہ میر دیکھو۔ جو شائع ہو چکا ہے، انسان و حیرت ہو جاتا ہے۔“

صاحب سیر المصنفین آزاد کو مکالمے کا ہم پایہ قرار دیتے ہیں کیونکہ ان کا خیال ہے کہ وہ جذبات کی رو میں بہہ جاتے ہیں اور سکینہ کا خیال ہے کہ تعصب کی عینک چڑھ جاتی ہے تو ذوق جیسے شاعر کو خدائے سخن غالب سے مقابلہ پر ہی نہیں لے آتے بلکہ بڑھا دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ آزاد نے غالب کو گھٹایا حالانکہ ذوق اور غالب کا مرتبہ صاحبان ذوق، سلیم سے پوشیدہ نہیں مقرر نے بھی اعتراف کیا ہے کہ آزاد نے اکثر صاحبان کمال کا ذکر

آب حیات میں نہیں کیا۔ لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ ان کے حالات نہ مل سکتے ہوں۔
 کیونکہ سوائے چند قدیم تذکروں کے جو برائے نام تذکرے تھے، آزاد کے پاس
 کوئی اور معلومات کا ماخذ نہ تھا، یا تھیں تو محض سنی سنائی باتیں، اب مثلاً
 ذکر موتمن کی فروگزاشت پر نواب صدیر الجنگ بہادر کیا خوب تحریر فرماتے ہیں۔
 ”آخر انیس و دہر کا ذکر بھی پہلی ایڈیشن میں نہ تھا۔ دوسرے

ایڈیشن میں موتمن، انیس اور دہر سب ہی آ گئے۔“

آزاد نے جو کچھ بھی لکھا اپنی حد تک بعد تلاش و تحقیق کے لکھا، سائنٹفک
 طریقہ پر کسی واقعہ کو ثابت کرنا ایک ادیب یا شاعر کا فریضہ بھی تو نہیں ہے۔
 تاہم انھوں نے ادب کی بہت ساری خدمات اور بھی تو انجام دی
 ہیں، مثلاً ان کے ایران کے دوسفر، ان کی زبان و محاورہ کی تحقیق جتنی
 یہ دل چسپ روایت دھرانے طبیعت چاہتی ہے :-

تقریباً ۱۸۸۸ء میں وہ کتاب خانہ آزاد کی عمارت تعمیر کر دارہے تھے۔
 ایک کمرہ بن چکا تھا اور فرط اشتیاق سے اس میں چند الماریوں کی ترتیب
 اور خانہ پری میں مصروف تھے۔ اتفاق سے محاورہ کی صحت استعمال کا
 ذکر چھڑ گیا۔ فرماتے لگے کہ ایک غیر زبان کے محاورہ کو صحیح اور باموقع استعمال
 کرنا بہت مشکل ہے اور یہ دل چسپ روایت بیان کی :-

”ایک دن میں ایران کے ایک صاحب خانہ کا مہمان تھا“
 کھانا پک رہا تھا۔ اس دس بارہ برس کی لڑکی کو چولہے کے پاس
 چھوڑ کر آپ اندر کے دالان میں کوئی کام کرنے لگی اور لڑکی سے
 کہتی گئی کہ دیگچی کا خیال رکھے، تاکہ کھانا جوش کہا کر ابل نہ پڑے،
 رفتہ رفتہ آنچ تیز ہوتی گئی۔ اب میں نے سوچا کہ چاول ابل کر
 نکل پڑیں گے، دیکھوں تو اس کیفیت کو یہ لڑکی کن الفاظ میں
 ظاہر کرتی ہے۔ اس خیالی کیفیت کے مختلف اظہار گھڑتا تھا کہ
 شاید یہ کہے گی، یہ کہے گی کہ وہ وقت آپہنچا اور میرے تمام خیالی
 خیالی پلاؤ ثابت ہوئے۔ جوں ہی دیگچی میں چاول جوش کھانے سے
 اس کا ڈھکنا ایک طرف سے ایک آدھ آنچ اوپر کو اٹھا کہ لڑکی
 بیچنی۔ اماں اماں دیگچہ سر کردہ۔ یہ لفظ گویا میرے کانوں میں
 الہامی کلمہ کی طرح پڑے اور میری آنکھیں کھل گئیں۔

جس شخص کو زبانذانی کا یہاں تک مذاق ہو۔ جو اس قدر نکتہ رس اور
 صاحب تلاش ہو۔ جس نے غیر زبان کی تحقیق میں اس درجہ کاوش اور
 کوشش کی ہو وہ خود اپنی زبان میں کیا کچھ نہ کر دکھاتا اور حق امر یہ ہے کہ
 اردو میں آنند نے وہ کچھ کر دکھایا جس کی ان جیسے شخص سے توقع کی جاسکتی تھی

کے گینوں سے ایسا جڑ دیا ہے کہ اس میں شرمیم کرنا قل ہو اللہ کا جواب کہنا ہے
مثلاً میر تقی میر کے لیے لکھا ہے۔

”غزلوں کے دیوان اگرچہ طب و یابس سے بھرے ہوئے

ہیں۔ مگر جہان میں انتخاب ہیں وہ فصاحت کے عالم میں انتخاب ہیں“
یا پھر تیر کو لکھنؤ کے ایک نواب نے اپنے گھر لے جا کر رکھا کہ ان کی دل بستگی ہو ان کے
لیے ایک ایسا کمرہ تجویز کیا جس کے درپے ایک خوشنما باغ میں کھلتے تھے۔ لیکن
میر صاحب کہ بے نیازی و خود فراموشی میں اپنا جواب تھے، جن کے لیے باغ اور
ویرانہ دونوں ایک ہی مفہوم رکھتے تھے۔ انھیں برسوں خبر نہ ہوئی کہ جہاں وہ
لائے گئے ہیں وہاں ایک باغ بھی ہے۔ دراصل وہ اپنے باغ سخن کی سیر میں
محو و سرگرداں تھے۔ ان کی اس سرخوشی پر آزاد لکھتے ہیں۔

”کیا محویت ہے کئی برس گذر جائیں۔ پہلو میں باغ ہو اور

کھڑکی تک نہ کھولیں، خیر۔ ثمرہ اس کا یہ ہوا کہ انھوں نے دنیا
کے باغ کی طرف نہ دیکھا۔ خدا نے ان کے کلام کو وہ بہار دی کہ
ساہا سال گذر گئے۔ آج تک لوگ ورقے الٹتے ہیں اور گلزار سے

زیادہ خوش ہوتے ہیں۔“

اس پر ایہ تنقید پر کیا کوئی حاشیہ چڑھا سکتا ہے۔ یہ آزاد کے زبان کا متر ہے جو

من کو موہ لیتا ہے۔ افشا کے غزلوں کے دیوان دیکھ کر خیالات کی ہنگامہ خیزی دیکھیے۔

”عجب طلسمات کا عالم ہے۔ زبان پر قدرت کامل، بیان کا لطف، محاوروں کی نمکینی، ترکیبوں کی خوشنما تراشیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ مگر ابھی کچھ ہیں، ابھی کچھ ہیں۔ غزلوں میں غزلیت کے اصول کی پابندی نہیں سبب یہ ہے کہ وہ سخن آفریں ایک خیرہ وافر مضامین و الفاظ کا اپنے پاس رکھتا تھا۔ اس سے جس قسم کی مخلوق چاہتا تھا پیدا کر لیتا تھا۔“

سودا کے باب میں آب حیات کے ۲۱ صفحے بھر دیے ہیں۔ ان اوراق کو تنقید تو صاف لطائف و ظرائف سے مرصع و مزین کیا ہے۔ عام رائے کلام و نثر اردو پر دیکھیے، جھوٹے چھوٹے جلوں میں کتنی بجلیاں بھری ہیں۔

”ان کا کلام کہتا ہے کہ دل کا کنول ہر وقت کھلا رہتا تھا۔

اس پر سب رنگوں میں ہم رنگ اور ہر رنگ میں اپنی ترنگ، طبیعت شورش و جوش سے بھری ہوئی، نظم میں تو سب کو معلوم ہے کبھی دودھ ہے تو کبھی شربت، مگر نثر میں بڑی شکل ہوتی ہے۔ فقط مصری کی ڈلیاں چبانی پڑتی ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ نثر اردو ابھی سچے ہے۔ زبان نہیں کھلی۔ چنانچہ شعلہ عشق کی عبادت

سے واضح ہے کہ اُردو ہے مگر مرزا بیدل کی نشتر فارسی معلوم ہوتی ہے۔
 آزاد نے پُرانی شاعری پر قلم فرسائی کی اور یہ خود بھی پُرانی تنقید کے معاد تھے۔ مگر
 اس کے باوجود انھوں نے اپنی تنقیدات کو ایک ایسے مقام پر پہنچایا ہے جو اپنی
 تیور کے اعتماد سے تمام ترجمید وضع و اسلوب کا سرمایہ معلوم ہوتا ہے، محض زبان
 جب تنقید کرتے ہیں تو اس قدر جامع اور ملغ۔ پھر جب کلام کے مضامین پر
 نظر ڈالتے ہیں تو پورا کلام ان کے قلم کے آگے لرزنے لگتا ہے۔

لوگ جب ذوقیات کی رُو سے شعر کو پسند کرتے ہیں تو بجائے اس کے کہ ہلو
 پر ان کی نظر ہوتی، کلام کی ایک آدھ بات کو اخذ کر کے کبھی اس کا نام نشتر و خنجر
 رکھ دیتے ہیں کبھی کسی شعر کو آہ سے تعبیر کرتے ہیں کبھی واہ سے معنون کرتے ہیں۔
 اور زمانہ قدیم میں تنقید کا پیرایہ ہی یہ تھا۔ میر کے کلام کے لیے آہ اور سودا کے لیے
 واہ تو عرب المثل بن گئی۔ غالب نے بھی میر کے شعر کے لیے کہا ہے کہ

”نشتر کی طرح چھتا ہے۔“

ناصح کے بڑے بول کا سراسر طرح نیچا کیا ہے۔ شعر
 سرمہ منظور نظر ٹھہرا جو چشم یار میں نیلگوں گنڈا پہنایا مردم بیمار میں
 آزاد کی سمجھ میں نہیں آتا کہ بیمار میں گنڈا کیونکر پہناتے ہیں گنڈا بیمار کو پہناتے
 اب لیجیے غالب کو۔ غالب کے کلام کی دھوم دھام تمام ربیع سکون میں مچی

ہوئی ہے لوگ اس کے کلام کی طرح طح سے داد دیتے ہیں۔ ایک ایک شعر پر ہر دھنٹے ہیں۔ دیوان برلن میں تک شائع ہوا ہے۔ ایک برلن کیا دیوان غالب کے جتنے ایڈیشن نکلے شائد ہی کسی اور کو یہ بات نصیب ہوئی ہے۔ ہمارے استاد تنقید یعنی آزاد بھی اس کے کلام پر رائے زنی کرتے ہیں تو فرماتے ہیں۔

”جس قدر عالم میں مرزا کا نام بلند ہے اس سے ہزاروں درجہ عالم معنی میں کلام بلند ہے، بلکہ اکثر شعرا ایسے اعلیٰ درجہ رفعت پر واقع ہوئے ہیں کہ ہمارے نارسا ذہن وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔“

”شہرت عام و بقاء دوام کے دربار“ میں غالب کی ہستی کا اصل معہ حل کر دیا، دساری عمر لوگ غالب کو لکھتے رہیں گے مگر ایسے خیالات جمع نہیں کر سکتے۔ یہ وہ فقرے میں جو صرف آزاد ہی کی ملک ہو کر رہ گئے۔

”غالب اگرچہ سب سے پیچھے تھے، پر کسی سے نیچے نہ تھے۔ بڑی دھوم دھام آئے اور ایک نقارہ اس زور سے بجایا کہ سب کے کان گنگ کر دیے۔ کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا مگر سب واہ واہ سبحان اللہ کرتے رہ گئے۔“

کچھ ٹھکانہ ہے اس تنقید کا۔ دو ایک جملوں میں غالب کو اتنا سمجھا گئے کہ ایک دفتر بھی اتنا نہ کر سکتا۔

آزاد کی آب حیات کے بعد خوشہو تذکرہ مطبع کے حوالہ ہوا وہ گل رہا ہے۔

جس کہ بہت خوب لکھا ہے۔ لیکن آب حیات سے اپنی تشنگی ضرور بجھائی ہے گلے
پر آب حیات کا بہت اثر پڑا ہے۔ آزاد نے جو شرابے پیدا کیے ہیں ان میں سے
گل رعلی نے اپنے چراغ روشن کیے ہیں۔ اس کی رعلی میں بہت بڑا حصہ آب حیات کا
صم ہے۔ مثلاً حاتم کے ذکر میں آزاد ہی کا ذکر خیر آیا ہے۔ ”صاحبزادہ بھی پانچ ہزار
سے زیادہ کا مال نفل میں دبائے بیٹھا ہے“ یا منظر جان جاناں کے لیے بھی آب حیات
سے ساغر بھر رہے۔ یا پھر انشا کے بیان میں آب حیات سے خوشہ چینی کر کے بیان
میں رعلی پیدا کی ہے۔ غرض انھوں نے ان کے جلے کے جلے لیے ہیں تنقید
کرنا چاہتے ہیں مگر کر نہیں سکتے۔ تنقید کے ہتھیار ڈال کر آزاد کو بھنسنے نقل کر دیتے ہیں
سکسینہ تمام تذکروں کا نچوڑ اور مجموعہ ہے۔ یا یوں کہیے کہ ایک معجون کب
اکثر وہی باتیں ترجمہ کی ہیں جو آزاد کے ہاں موجود ہیں۔ پس اس کی خصوصیت
یہ ہے کہ یہ انگریزی میں ہے اور جن سے اس نے اپنی دکان بچائی ہے وہ سب
اردو میں۔ ڈاکٹر گرامام بلی کا تذکرہ اس کا خلاصہ ہے۔

اب رہا آزاد پر غلط بیانی کا الزام، اس کے متعلق اب حیات کا دیباچہ
دیکھنے سے متضح ہو جاتی ہے کہ آزاد نے کہاں سے خیالات کا انبار لگایا اور کیسی
تحقیق کی اس میں کوئی شک نہیں کہ آزاد نے غلط واقعات لکھ دیے ہیں اور
قدرتی بات بھی تھی۔ اس سے زیادہ ان کا بس ہی کیا چل سکتا تھا۔ انھوں نے

یہ تذکرہ اور تذکروں کی مدد، نیز ان حالات سے جو بزرگوں سے سنے تھے لکھا ہے۔ انھوں نے کتاب کے دوران میں اپنے ماخذ کا حوالہ بھی درج نہیں کیا۔ ایک مقام پر اپنے نوٹ میں حکیم قدرت اللہ کا حوالہ دیا ہے اور ایک مقام پر مظہر کے بیان میں معمولات مظہری کا ذکر کیا ہے، جو چیزیں کہ انھوں نے اور تذکروں میں دیکھ کر لکھیں اس کے یہ ذمہ دار تو نہیں ہیں۔ جیسے لوگ لکھتے آئے ہیں ویسے ہی انھوں نے لکھ دیے ہیں۔

دوسرا پہلو سنائے واقعات کا ہے۔ ہمارا لٹریچر اس قدر پرانہ اور منتشر ہے کہ آزاد کے زمانے میں تو خیر آج تک کسی بڑے سے بڑے کتب خانہ میں لٹریچر کے کسی شعبہ کی تکمیل کے لیے پورا تو کیا قدر قلیل بھی سرمایہ میسر نہیں آ سکتا۔ یوں بھی دیکھا جائے تو لٹریچر شائع نہیں ہوا۔ قلمی نسخوں کی شکل میں موجود ہے۔ کسی چیز کا کوئی تذکرہ کسی رسالہ میں شائع ہو جاتا ہے کسی کا کوئی حصہ کسی کتاب میں سے مل جاتا ہے۔ اب حیات کے ۵۰، ۶۰ سال بعد اردو کے کسی پہلو پر کوئی محققانہ کام سلیقہ کا نہیں ہو سکتا تو آزاد کے زمانہ میں کیا توقع ہو سکتی تھی۔ تاہم واقعات کی جانچ کا راستہ سب سے پہلے عالی جناب نواب صدیق خان بھادر نے کھولا اور دوسرے ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش ہی کرتے رہے۔ پھر بھی گویا تحقیقات کے آسمان کا دروازہ کھل گیا ہے۔

آزاد کا درجہ اردو ادب میں

(۲)

ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں کہ ہم اس موضوع کی ابتدا نواب صدر یار جنگ بہادر جیسے مشہور ادیب اور ادب نواز کے اس فقرے سے کریں۔ صاحب معرہ راقم فرماتے ہیں۔

ردِ اردو میں انشا پر د ازاب تک ان سے بہتر نہیں ہوا۔
انھیں کی نثر اردو میں ایسی ہے کہ جتنی بار پڑھی جائے لطف حاصل ہو۔

کیا درست فرمایا ہے آزاد اردو نثراروں میں ایک نمایاں اور ممتاز حیثیت رکھتے ہیں اور ایک خاص طرزِ تحریر کے مالک ہیں۔ جس طرح خطوط نویسی میں باوجود کوشش کے غالب کی ہم سہری محال ہے اسی طرح آزاد کا طرز بھی انوکھا اور ناقابلِ تقلید ہے۔ انھیں زبان پر وہ قدرت حاصل تھی، جو خاص اہل زبان بلکہ ان سے بھی بڑے زبان دان کا حقمہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کا انداز بیان بے حد دل نشیں اور موثر ہے۔ ان کی زبان میں کچھ ایسی خوبیاں ہیں جن سے دل لطف اٹھا سکتا ہے مگر انھیں قلم بند نہیں کیا جاسکتا۔ شاید آزاد ہی کے لیے کسی نے کہا۔

کسی کی آنکھ میں جادو تیری زباں میں ہے

آزاد کا شمار اردو زبان کے ان نامور انشا پردازوں میں کیا جاتا ہے جن پر اردو ادب اب تک نازاں ہے جن کا ذکر حفیظ انجمی نے رسالہ ساقی پانچ نمبر سہ ماہی میں ”اردو کے عناصر خمسہ“ کے عنوان سے کیا ہے۔ وہ اپنے مضمون کی ابتدا امہدی الافادی کے اس شاعرانہ بلیغ جملے سے کرتے ہیں ”سر سید سے مغفولت الگ کر لیجیے تو کچھ نہیں رہتے۔ نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے۔ شبلی سے تاریخ لے لیجیے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے۔ حالی بھی جہاں تک نثر کا تعلق ہے سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں۔ لیکن آقائے اردو پر وفیسر آزاد صرف انشا پرداز ہیں جن کو اور سہارے کی ضرورت نہیں“ اگر سچ پوچھیے تو اردو ادب کی ترکیب اصلی، انھیں پانچ عناصر یعنی آزاد، حالی، نذیر احمد، سر سید اور شبلی سے ہوئی ہے یعنی اردو ادب کا علمی ذخیرہ تمام نثر انھیں ممتاز و مشہور مصنفین کی کوشش کا اندوختہ ہے، باقی دوسرے مصنفین ایک حیثیت ثانی رکھتے ہیں اب جب تک ہم ان سب کی ادبی حیثیت پر روشنی نہ ڈالیں مدح سرائی کی تمہید لا علمی میں رہتی ہے۔ ایک کی نسبت دوسرے کی رائے سنئے یہی حال ہے کہ

”سر سید اردو ادب سے مخصوص دل چسپی نہیں رکھتے تھے“

ان کے کارناموں کی تہ میں مذہبی اصلاح کا جذبہ کام کر رہا تھا۔“

ان کے ”تہذیب الاخلاق“ جاری کرنے کا اصل مقصد مسلمانوں کی اصلاح و ترقی تھی۔ ان کے پیش نظر یہی ایک مقصد تھا جس کو انھوں نے مختلف ذرائع سے اجاگر کیا۔ ان کی سائنٹفک سوسائٹی، خطبات احمدیہ، تفسیر قرآن، مدرسۃ العلوم اور ایجوکیشنل کانفرنس ایک ہی مرکز و مقصد کو لیے ہوئے پھولے پھلے۔ ان کی نشریں روانی و برجستگی ناپید ہے۔ بلکہ بقول نعیمی صاحب ”بہت سے جملے کے جملے ایسے معلوم ہیں جیسے عربی عبارت کا با محاورہ لفظی ترجمہ کیا ہے اگر اس میں مبالغہ نہیں ہو تو ہماری ادنیٰ رائے بھی یہی ہے کہ سرسید کو ہر لحاظ سے ایک بڑا انسان کہا جاسکتا ہے لیکن ایک بڑا اناشاید نہیں کہا جاسکتا“

ان کی اصلاحی ترقیوں کا لحاظ کرتے بلاشبہ ان کا ہر کارنامہ تعمیری کہلائے جانے کا مستحق ہے نہ کہ ادبی۔ وہ ایک بہترین قومی تصلح ہیں لیکن اتنے بڑے انشا پرداز نہیں۔

سرسید کے بعد حالی آتے ہیں۔ کیونکہ بقول مہدی مرحوم۔

”ان کے قلم کو جو ہاتھ میں لے سکتا ہے وہ مولانا حالی ہیں“

اور بقول نعیمی حالی نے نشر لکھی اور ایک عمدہ نثار بن کر لکھی۔ ماما کہ ان کی نشر سلیس سادہ متین و سنجیدہ ہے لیکن بعض اوقات یہی سادگی اس کو ایسا

”روکھا، پھیکا“ بنادیتی ہے کہ ادبی جھلک ناپید ہو جاتی ہے۔ پھر ان کی انگریزیت سے ”حیات جاوید“ کی دنیا معمور ہے۔ یہ ایک نمایاں سقم ہے ان کی علمی کارناموں کا، حیات سعدی، یادگار غالب اور حیات جاوید ان کی بہترین تصانیف ہیں۔ مگر ان سب کا ڈگر وہی سوانح حیات ہے۔ ان کا مقدمہ شعرو شاعری باوجود مختصر ہونے کے ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ نعیمی صاحب کی یہ رائے کس قدر سخت اور صحت سے معرا معلوم ہوتی ہے مگر اس میں صلیت کی کچھ نہ کچھ جھلک ضرور موجود ہے۔

حالی کے بعد ذیر احمد کا نمبر آتا ہے۔ جو دو خصوصیات کے حامل ہیں۔ ناول نگار بھی ہیں، مذہبی مصنف بھی، ان کو اردو کا پہلا ناول نگار کہا جاسکتا ہے۔ اگرچہ ان سے پہلے بھی اردو میں قصے اور ناول پائے جاتے تھے۔ لیکن اس پایہ کے نہیں۔ ان کے ناول عام طور پر ”مقصودی“ ہوتے ہیں اور ان میں ضرورت سے زیادہ سبق آموزی سے کام لیا گیا ہے۔ ان کے مراۃ العروس، نبات النض، توتہ النصوح اور ابن الوقت بلند پایہ تصانیف ہیں۔ مولوی فرحت اللہ صاحب نے ان پر بھی تقریباً چوڑ چلی ہے کہ وہ چلتے چلتے عربی الفاظ کے روٹے ہی نہیں بچھاتے تھے بلکہ پہلوڑ رکھ دیتے تھے۔ لیکن ہمارے نزدیک ان کا یہ اعتراض ان کی عام روانی و بے ساختگی کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

ان کے شبلی آتے ہیں۔ جن کی تحریروں کے زبردست رہنما سر سیدؒ
 حالیؒ، نذیر احمد اور آزاد ہیں۔ ”استدلال انھوں نے سر سید سے سیکھا۔ تحقیق آزاد
 سے لی۔ زور بیان نذیر احمد کا لیا اور سادگی، صفائی حالی سے سیکھی۔ اس لیے
 ان کا طرزِ تحریر ان کے معاصرین کی تمام خوبیوں کا حامل ہے۔“ گویا شبلی
 ایک مجنوں مرکب طرز کے مالک ہیں آزاد کی رنگینی، حالی کی سادگی اور نذیر احمد کا
 زور بیان و بے ساختگی کو موقع و محل سے استعمال کرتے ہیں۔ آزاد کی آبِ حیات
 کا اثر شبلی کی شعرِ العجم یا سیرۃ النبیؐ میں دیکھیے۔ کہیں کہیں جملے کے جملے آگئے
 ہیں اور شاید ان کے تیل سے اپنا چراغ روشن کیا ہے۔ شبلی کا طرزِ مولویانہ ہے
 مگر آزاد کے عنصرِ بلیغ کو شبلی نہیں پہنچ سکتے۔ ان کی رنگینی خیال کو البتہ شبلی
 نے آنکھوں سے کابل کی طرح لے لیا ہے لیکن ان کے طرز کی رنگینی نہیں لے سکے۔ جو
 صرف آزاد ہی کا حصہ ہو کر رہ گئی ہے۔ نعیمی صاحب فرماتے ہیں۔

”حقیقتاً نذیر احمد اور آزاد صاحب طرز کہے جاسکتے ہیں
 سر سیدؒ، حالیؒ اور شبلیؒ نہیں۔ صاحب طرز سے میرا مطلب یہ ہے کہ
 ایک ایسے طرز کا مالک جس میں انفرادیت بہت بڑی حد تک
 نمایاں ہو۔ صرف ایک ہی جملہ سے یہ اندازہ ہو جائے کہ یہ
 جملہ فلاں شخص کا ہے۔“

قصہ مختصر شبلی کی شہرت و مقبولیت غنی حیثیت مورخ کے ہے اتنی
حیثیت انشا پر داز کے نہیں۔

اب آزاد کو لیجئے۔ نہ یہ سواخ نگار ہیں نہ مورخ، نہ مذہبی مصنف ہیں
نہ ناول نویس، وہ محض انشا پر داز ہیں اور بس۔

آزاد اپنی تصانیف میں اپنے آپ کو دھراتے ہیں۔ عام طور پر اہل قلم
دو چار تصنیفات کے بعد تھک جاتے ہیں۔ ان کا قلم نقش و نگار کا کٹھا
ڈال دیتا ہے۔ تیسری سے جہاں چوتھی تصنیف ہوئی الفاظ کی تکرار تشبیہ
استعارے کی تکرار، پیرایہ کی تکرار، پوری زبان کی تکرار۔ غرض یہ کہ مصنف
اپنی ذات اور ذہنیت اور طرز کی تکرار ہی تکرار کرنے لگتا ہے اور جب یہ قلم
پیش آجائے تو اس کی نئی کتاب پڑھنے کو دل اُمادہ نہیں ہوتا اور کسی مجبوری
سے پڑھنے بھی لگیں تو جی بار بار اُجاٹ ہو جاتا ہے۔

نعمی صاحب فرماتے ہیں کہ ”پوری کی پوری تصانیف ایک ہی رنگین
درواں انداز میں لکھ دیتا یہ آزاد کے سوا نہ کوئی کر سکا نہ امید ہے کہ اس کے
پس اس یگانہ عصر ادیب نے حقیقت میں نثر میں شاعری بلکہ ساحری
کی ہے۔ بقول سعید انصاری۔

”تذیر احمد کے اسلوب کی راشد الخیری نے مولانا حالی کی

مولوی عبدالحق نے پیروی کی۔ لیکن آزاد اپنے میدان کا تنہا
 شہسوار ہے۔ اگرچہ نصیر حسین خاں خیال نے کوشش کی تھی لیکن
 کوئی شہکار نہیں چھوڑا۔“

سنئے تو آزاد کے معترضین (جنہوں نے کہا ہے کہ آزاد کا طرزِ تحریر سنجیدہ
 موضوعات کے لیے موزوں نہیں) سے حفظِ نعیمی کیا پوچھتے ہیں۔

”کیا تاریخ، سوانح، ادبی تنقیدات، ادبیاتِ مکاتیب‘

سفرنامہ اور لسانیات (فیلالوجی) وغیرہ سنجیدہ موضوعات نہیں ہیں؟“

ادبی تنقید ایک خشک اور روکھا، پھیکا موضوع ہے۔ لیکن ہمارے انشا پرداز
 کی انشا پردازی یہاں بھی آشکارا ہے۔ تاریخ دیکھنی ہو تو دربارِ اکبری اٹھا کر
 دیکھو اور زبان کی تاریخ کے لیے اب حیات کا دیباچہ پڑھو۔ ذرا بقائے دوام کا
 دربار دیکھو۔ جہاں تاریخ بھی ہے، ادب بھی۔ رنگینی بھی ہے، رعنائی بھی۔ اب
 اگر مولانا شبلی اپنی تاریخِ دانی کی روشنی میں اس کے کسی فقرے پر یہ اعتراض کریں
 تو اس کی قدر و قیمت میں کوئی کمی نہیں آتی۔ آزاد غریب کو تاریخِ دانی کا دعویٰ
 ہی کب تھا۔

غرض آزاد نے صرف اُردو زبان کی خدمت کی۔ اُردو کی تاریخ لکھی شعرا کی
 سوانح لکھیں ان کے کلام پر تنقید و تبصرہ کیا۔ اُردو داں پبلک کے لیے آبِ حیات،

نیز نگ خیال، ڈرامہ اکبر لکھ کر اردو ادب میں افسانے، قصے اور ڈرامے کا شاندار اضافہ کیا، پنجاب کے لیے چھوٹی چھوٹی درسی کتابیں لکھ کر پنجابیوں کو اردو سیکھنے میں مدد دی۔ علوم میں علم الاسنہ پر وہ ضخیم کتاب لکھی جس نے ایک نیا راستہ بنایا۔ جس شاعری کا جھنڈا لیے ہوئے ہندوستان کے مشہور ترین شعرا آگے بڑھ رہے ہیں سب سے پہلے وہ حاکمی نے نہیں، آزاد نے بلند کیا تھا۔ آج جو وسیع میدان ہمارے شاعروں کے سامنے ہے اس کا راستہ اسی خادم قوم نے سمجھایا تھا جسے دنیا آزاد کے نام سے یاد کرتی ہے۔ آزاد ہی وہ شخص تھا جس نے اپنی زبان اور اپنے ادب کی خدمت پر اپنے ہوش و حواس اپنی صحت اور اپنی زندگی کو قربان کر دیا۔

مدی الافادی نے جن کی نسبت شبلی نے لکھا ہے۔ ”کاش شعر الجم کے مصنف کو ایسے دو فقرے بھی لکھنے نصیب ہوتے“ آزاد کی عدیم النظیر انشا پر داد کی داد اس طرح دی ہے۔

”مہر النساء کا وہ واقعہ کس قدر دل چسپ ہے جب اس نے باغ کی ایک روش پر چھا نگیر کے ہاتھ سے کبروترے کر چھوڑ دیے تھے، پروفیسر آناؤ نے جس خوبصورتی سے اس کو دکھایا ہے انشا پر داد کی کو آج تک اس سے بہتر الفاظ نہ مل سکے“

واقعہ دیکھیے واقعی کتنا دل چسپ ہے۔

”دنیا کے معاملات سخت نازک ہیں۔ کوئی بات ایسی نہیں

جس کے فوائد کے ساتھ نقصان کا کھٹکانہ لگا ہو، اسی آمد و رفت

میں سلیم (جھانگیر) کا دل زین خاں کو کہ کی بیٹی پر آیا اور ایسا

آیا کہ قابو ہی میں نہ رہا، غنیمت ہوا کہ اس کی ابھی شادی نہ ہوئی

تھی۔ اکبر نے خود شادی کر دی۔ لیکن قابل عبرت وہ معاملہ ہے جو

کہن سال بزرگوں سے سنا ہے یعنی یہی مینا بازار لگا ہوا تھا گیٹ

پڑی پھرتی تھیں۔ جیسے بلغ میں قمریاں یا ہریا ول میں ہرنائیں

جہانگیر ان دنوں فوجوان لڑکا تھا۔ بازار میں پھرتا ہوا چن میں آنکھلا

ہاتھ میں کبوتر کا جوڑا تھا۔ سامنے کوئی پھول کھلا ہوا نظر آیا کہ

عالم سرور میں بہت بھایا۔ چاہا کہ توڑے۔ دونوں ہاتھ رُکے ہوئے

تھے۔ وہیں ٹہر گیا، سامنے سے ایک لڑکی آئی۔ شہزادہ نے کہا کہ

لو ہمارے کبوتر تم لے لو، ہم وہ پھول توڑ لیں۔ لڑکی نے دونوں

لے لیے شہزادہ نے کیاری میں جا کر چند پھول توڑے۔ پھر کرایا

تو دیکھا کہ لڑکی کے ہاتھ میں ایک ہی کبوتر ہے۔ پوچھا دوسرا کبوتر

کیا ہوا عرض کی، صاحبِ عالم وہ تو اڑ گیا۔ پوچھا، ہیں، بکوتر اڑ گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دوسری ٹٹھی بھی کھول دی کہ حضور یوں اڑ گیا۔ اگرچہ دوسرا بکوتر بھی ہاتھ سے گیا، مگر شہزادے کا دل اس انداز پر لوٹ گیا۔ پوچھا، تمہارا نام کیا ہے۔ عرض کی، مہر خانم۔ پوچھا، تمہارے باپ کا کیا نام ہے۔ عرض کی، مرزا غیاث۔ حضور کا ناظم بیوتات ہے۔ کہا اور امراء کی لڑکیاں محل میں آیا کرتی ہیں۔ تم ہمارے ہاں نہیں آتیں۔ عرض کی، میری امان جانا تو آتی ہیں مجھے نہیں لائیں۔ ہمارے ہاں لڑکیاں گھر سے باہر نہیں نکلا کرتیں۔ آج بھی بڑی منتوں سے یہاں لائی ہیں۔ کہا، تم ضرور آیا کرو۔ ہمارے ہاں بڑی احتیاط سے پردہ رہتا ہے۔ کوئی غیر نہیں آتا۔“

پھر بھی ہندی ایک واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

در لاہور میں پہلی دفعہ جب ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ ہوا تو پروفیسر آزاد زندہ تھے۔ نذیر احمد ملنے گئے۔ شبلی وصالی بھی ساتھ گئے۔ نذیر احمد کا لکچر ہونے والا تھا۔ جو چھپا ہوا ان کے ہاتھ میں تھا۔ انھوں نے یہ کہہ کر آگے بڑھا دیا کہ ایک نظر دیکھ لیجئے۔

آزاد فوراً قلم سنبھال کر بیٹھ گئے اور کاٹ پھانٹ شروع کر دیا۔
 نذیر احمد آزاد کی اس بے تکلفی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ جو جن محنت
 سے ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ ان کو خیال ہوا کہ ابھی ان کے
 دائرے میں ایک شخص ایسا موجود ہے جو ”بوڑھے بچے“ کی مشق
 سخن پر نظر ثانی کر سکتا ہے۔“

مولانا حالی، آزاد کی نسبت لکھتے ہیں۔

”نظم و نثر میں بہت کچھ لکھا جا رہا ہے، یعنی لٹریچر کے رقبے
 کا طول و عرض بڑھ گیا ہے۔ لیکن اس کا ارتقاع جہاں تھا وہیں
 رہا، یعنی اخلاقی سطح بہت اونچی نہیں ہوئی۔ لیکن آزاد کی پاکیزہ
 خیالی اور خوش سیانی نے یہ کمی پوری کر دی۔“

شبلی اپنے کمالات کے باوجود آزاد کا ادب کرتے اور فرماتے تھے۔

”آزاد اردوئے معلیٰ کا ہیرو ہے۔ اس کو کسی سہارے
 کی ضرورت نہیں، وہ اصلی معنوں میں ایک زبردست انشا پرداز ہے۔“

مولانا عبد اللہ عادی میرے خط کے جواب میں ارقام فرماتے ہیں۔

”آزاد انشا پردازی اور نثر نگاری کے شہنشاہ تھے۔

ان کے اسلوب کی ابتداء انہیں سے ہوئی اور انہیں پر انتہا

ہو گئی۔ شاعر تھے مگر شاعری میں کوئی نمایاں کام نہ کر سکے۔ پھر بھی
لاہور کو ہنوز وہ ادبی صحبتیں فراموش نہیں ہوئیں۔ جن کے چشم و
چراغ مولانا حالی اور مولانا آزاد تھے۔

کیفیت دہلوی آزاد کی نسبت یہ حسن خیال رکھتے ہیں۔

آزاد وہ موجد عالم ایجاد سے مُنہ موڑتا ہے جس کے ایجاد و جدت
آفرینی کے احسانات کے بوجھ سے اردو زبان کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی،
چاسر اور ایڈیسن نے جو احسان انگریزی نظم و نثر پر کیے ہیں، کیشو
اور پدما کرنے جو خدمات ہندی کاویہ کے حق میں کیں ان سے زیادہ
مہتمم بالشان اور گراں مایہ وہ خدمات اور وہ احسانات ہیں جو
آزاد نے اردو نظم پر بالخصوص اور اردو زبان پر بالعموم کیے ہیں۔
زلف و خال، حسن و عشق، رقیب و رازداں، محتجب و ناصح،
آہ رسا و مالا، شب گیر کے وہی قیود سے شعر کو آزاد کرنے کا سہرا آتا
ہی کے سر ہے۔ اس میں کچھ مبالغہ نہیں کہ اگر آزاد نے اس خیال نو
کی اشاعت و تمیل نہ کی ہوتی تو آج ہم ان نظموں سے نا آشنا
ہوتے جن میں قومی نظمیں، اخلاقی نظمیں، نئی شاعری یا نچرل
شاعری کہا جاتا یا ان سے منسوب کیا جاتا ہے۔

خصوصاً موجودہ دور زندگی میں ہر شخص یہ احساس رکھتا ہے کہ یہ نہایت عمل کا ہے، صرف تخیل ہی تخیل کام نہیں آسکتا۔ اقبال اور جوش کی نظمیں آزاد کی دگر باز قائم ہوئیں اور ایک جوشیلے طبقہ کے دل میں گھر کر چکی ہیں یہ وہی داغ بیل ہے جو آزاد نے ڈالی۔ اس سے انصاف پسند دنیا کبھی انکار نہیں کر سکتی۔

مولوی فرحت اللہ بیگ صاحب میرے خط کے جواب میں لکھتے ہیں۔

”آزاد مرحوم کی تحریر کا جتنا میں قائل ہوں شاید ہی اور

کوئی ہوگا تحریر کا جو رنگ انھوں نے اختیار کیا ہے اس کے وہی موجد اور وہی خاتم ہیں۔ دوسروں نے بھی اس رنگ کو اختیار کرنا چاہا مگر نبھانہ سکے۔ آخر چھوڑ بیٹھے۔ مرحوم کے قلم میں وہ زور

اور طرز بیان میں وہ اثر ہے کہ ان کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک فقرہ پڑھنے والے کے دل میں اتر جاتا ہے۔ غرض یہ کہ آزاد

اپنے رنگ کے بادشاہ تھے اور گو وہ رنگ اردو میں چلا نہیں کیونکہ کسی میں اس کے چلانے کا دم نہ تھا۔ لیکن جب تک دنیا میں اردو ہے اُس وقت تک آزاد مرحوم کی تحریریں عزت کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی اور سزا لکھوں پر رکھی جائیں گی۔“

آزاد کے خیالات کی روحانی کو ایک دریا سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جو بہتا ہے

اور اس کا تسلسلِ بولچلوں تغییر کا حامل ہوتا ہے۔ کبھی مرغزاروں میں سے اس کا گزرا ہوا تو وہاں کے پر کیفیت مناظر قدرت اور دلاویز نظارے اس کی سیدھی سادھی روش میں ایک لوح پیدا کر دیتے ہیں، کہیں یہ لقا و دق میدانوں میں سے ہوتے ہوئے گزرتا ہے تو کہیں سنسان وادیوں اور ویران صحراؤں کے خشک پتھر لیے آغوش میں جگہ پا کر اپنے سحر آگین نغموں سے ایک سنسنی خیز سستی پیدا کر دیتا ہے۔ کبھی اپنے امواج کے بے پناہ تھمیروں سے سنگین چٹانوں کو ٹکرا کر دل گداز نالے پیدا کرتا ہے تو کہیں پہاڑوں کی بلندیوں اور کہسار کے سایہ میں آبشار کے بھیس میں سرگوشیاں کرتے ہوئے فضا میں اپنی وجدانی کیفیات و جذبات کو منتشر کرتا رہتا ہے، غرض یہ کہ ایک گم کردہ راہ مسافر کی طرح جس کو منزل مقصود پر پہنچنے کے بعد اطمینان و آسودگی نصیب ہوتی ہو۔ یہ بھی بھرنا پیدا کنار سے وابستہ ہو کر اپنی ہستی کو مٹا دیتا ہے۔ یعنی یہی حال آزاد کی ادبی روانیوں کا ہے کہ ہر منزل پر اس کے ادب کا سرچشمہ ایک نئے قسم سے جلوہ نما ہوتا ہے۔

یا پھر آزاد کی ادبی جھلک اور اس کی ہنگامہ کن رعنائیاں چاند سے
مشابہت رکھتی ہیں جو اپنی ضیا پاشیوں سے ہر جگہ ایک نیا سماں، ایک نئی کیفیت، ایک نئی رونق پھیلا دیتا ہے اور شام غربت کی فضا میں اپنی

سوانح آزاد کے ماخذ

(ۛ)

- ۱- خیمانہ جاوید - جلد اول
- ۲- جدید اُردو شاعری
- ۳- فثورات کیفی
- ۴- سیر المصنفین جلد دوم
- ۵- گلِ رعنا
- ۶- ادب اُردو - سکینہ
- ۷- مولانا محمد حسین آزاد - مؤلفہ غالب الہ آبادی
- ۸- مجلہ مکتبہ - بابت خورداد ۳۳۴
- ۹- رسالہ ساقی (دہلی) بابت مارچ ۳۳۵
- ۱۰- اُردو کے اسالیب بیان
- ۱۱- (دیباچہ) یورپ میں دکھنی مخطوطات
- ۱۲- نکات الشعراء

- ۱۳- گرامم بلی
 ۱۴- دہلی کالج مرحوم
 ۱۵- مغل اور اردو
 ۱۶- مضامین فرحت جلد دوم
 ۱۷- مولانا شبلی۔ اردو کے بہترین انشا پرداز۔ سعید انصاری بی، آ
-

ان اصحاب کرم نے ازراہِ علم پروری اپنی بیش بہا معلومات سے مستفید فرمایا

- ۱۔ عالی جناب نواب صدربار جنگ بہادر
- ۲۔ جناب محمد شفیع صاحب پروفیسر اور ٹیل کالج لاہور
- ۳۔ جناب مولوی عبدالحق صاحب
- ۴۔ مولانا عبد اللہ عمادی صاحب
- ۵۔ مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی
- ۶۔ مولانا خواجہ حسن نظامی صاحب
- ۷۔ مولوی رضا اللہ صاحب و مولوی فرحت اللہ صاحب دہلوی
- (صاحبزادگان مولوی ذکاء اللہ صاحب مرحوم)
- ۸۔ مولوی مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب
- ۹۔ جناب آغا محمد اشرف صاحب ایم۔ اے۔
- ۱۰۔ جناب آغا محمد طاہر صاحب
- ۱۱۔ جناب بہارت چند صاحب ایم۔ اے۔

ادارہ ادبیات اردو کی مشہور و معروف کتابیں

مرقع سخن (جلد اول) | حیدر آباد دکن کے پچیس شعرائے دور آصفیہ کا با تصویر تذکرہ
پچاس سے زیادہ قصاویر اور چار سو سے زیادہ صفحہ مجلد قیمت (ص ۱۱۲)

مرقع سخن (جلد دوم) | حیدر آباد دکن کے پچاس دیگر شعرائے دور آصفیہ کا با تصویر
تذکرہ پچاس قصاویر چار سو صفحات مجلد قیمت (ص ۱۱۲)

سراج سخن | انتخاب کلام شاہ سراج اوزنگ آبادی - مرتبہ پروفیسر عبدالقادر سوری
مع سوانح شاہ سراج - صفحات (۱۲۰) قیمت (۱۲/۱۲)

ایمان سخن | انتخاب کلام شیر محمد خاں ایمان مرتبہ سید محمد صاحب ایم اے
مع سوانح ایمان صفحات (۱۲۰) قیمت (۱۲/۱۲)

فیض سخن | انتخاب کلام حافظ میسر الدین محمد فیض - مرتبہ ڈاکٹر
سید محی الدین قادری زور مع سوانح فیض صفحات ۱۲۴ قیمت (۱۲/۱۲)

بادہ سخن | انتخاب کلام ڈاکٹر احمد سین مائل مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مع سوانح و تصویر صفحات (۱۲۸) قیمت (۱۲/۱۲)

کیف سخن | انتخاب کلام سید رضی الدین حسن کیفی مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مع سوانح و تصویر صفحات (۱۲۲) قیمت (۱۲/۱۲)

متل سخن | انتخاب کلام نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز مرتبہ ڈاکٹر
سید محی الدین قادری زور مع سوانح و تصویر عزیز صفحات ۱۲۵ قیمت (۱۲/۱۲)

ورڈز ورتھ اور اس کی شاعری | مشہور انگریز شاعر کے حالات اور کلام پر تبصرہ
از مولوی حسین صاحب ایم اے مع تصویر شاعر قیمت (۱۲/۱۲)

ہندوستان کے مشہور شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کے حالات
ٹیگور اور اُن کی شاعری
 اور کلام پر تبصرہ از مولوی مخدوم محی الدین صہامی
 مع تصویر شاعر صفحات (۱۲۸) قیمت ۱۰/-

مرزا غالب کی قید و رنگ کے حالات مرتبہ مولوی
یوسف ہندی قید و رنگ میں
 محسن بن شبیر صاحبی ۱- ال ال بی قید و رنگ
 حیدرآباد کی سماجی زندگی کا خاکہ مصنفہ مخدوم محی الدین
 ہوش کے ناخن (ڈرامہ)
 میر حسن صاحبان صفحات (۹۶) قیمت (۷/-)

دلی اودنگ آبادی کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی مضامین کا
نذر ولی
 مجموعہ از لطیف النساء بیگم ام ۱، نجم النساء بیگم ام ۲، جہاں بانو بیگم ام ۳
 اور نعیم النساء بیگم ام ۴۔ صفحات (۲۴۸) قیمت صرف (۷/-)

کلام فانی پر نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز کی تنقیدوں کا
نقد سخن
 مجموعہ صفحات (۱۷۶) قیمت صرف (۷/-)

صاحبزادہ سکیش کی دلکش نظموں کا مجموعہ صفحات (۱۹۲) قیمت (۷/-)
گریہ و ہنسم
 دکن کے مشہور مردم خیز خطہ کی دلچسپ بانصورت تاریخ
 از اکبر صدیقی بی ۱ صفحات (۱۸۴) قیمت صرف (۷/-)

نوجوان انشا پرداز رشید قریشی کے دلچسپ اور ولولہ انگیز
من کی دنیا
 افسانوں کا مجموعہ صفحات (۱۶۰) قیمت مجلد صرف (۷/-)

مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی کی محققانہ تالیف
مدرس میں اردو
 صفحات (۲۰۰) قیمت مجلد (۷/-)

نذر دکن (باتصویر) | دکن کے متعلق خوانین دکن کے رشحات قلم مع عکس تحریر
تصاویر صفحات (۱۱۲) مجلد قیمت (۴۴/-)

محرم نامہ | شہادت کربلا کے متعلق دلچسپ معلومات باتصویر مجلد صفحہ (۱۱۲) مجلد قیمت (۴۴/-)

روح غالب | اردو اور فارسی کے مشہور شاعر اور انشا پرداز مرزا اسد اللہ خاں غالب
دہلی کی حیات اور کارناموں کی ایک مجلہ سرگزشت اور ان کے بہترین
اردو خطوط کے دلچسپ ادبی حصوں کا انتخاب جس کو ڈاکٹر سید محی الدین صاحب دہلی زور نے
نہایت محنت اور جاں فشانی سے مرتب کیا ہے اس کتاب میں پہلی دفعہ غالب کے خاندان
اور اعزہ اور ان کے سرالی اعزہ و اقارب کے تفصیلی شجرے بھی شائع کیے گئے ہیں۔
غالب کے حالات زندگی جس خوبی اور اجمالی کے ساتھ اس میں درج ہیں آج تک
کسی سوانح غالب میں شائع نہیں ہوئے۔

پرستاران غالب اور خاص کر وہ لوگ جو اس رفیع المرتبت شاعر کے صحیح اور
مستند حالات معلوم کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے یہ کتاب ایک نادر تحفہ ہے (۲۴۰/-)
صفحات باتصویر قیمت دو روپے آٹھ آنے (۸/-)۔

تایخ گو لکنڈہ | وہ کتاب جو کئی سال کی تحقیق اور محنت و معلومات کا نتیجہ
ہے حیدرآباد کے مشہور مورخ اور جامعہ عثمانیہ کے معلم تاریخ
پروفیسر عبد المجید صاحب مدیقی ام اے۔ ال ال بی نے اس کتاب میں سلاطین
قطب شاہیہ کی نہایت مستند اور مبسوط تاریخ قلم بند کر دی ہے۔ گو لکنڈہ اور اس کی
آس پاس کی سلطنتوں کے تعلقات، دکن کا مذہبی ارتقاء، بادشاہوں اور امیروں کے
حالات، مختلف لڑائیاں، علم و فضل کی سرپرستی، غرض ہر پہلو پر قدیم، نادر اور قلمی
تاریخوں کی مدد سے روشنی ڈالی ہے۔ اپنے موضوع پر پہلی کتاب جو اس اتہام سے لکھی گئی ہے۔

تایخ گو لکندہ باتصویر ہے اور اس کی تصویریں بھی اس کے مواد کی طرح
قدیم تاریخی مآخذوں سے حاصل کی گئی ہیں۔ بڑی سائز، ڈھائی سو صفحات،
خوب صورت جلد قیمت تین روپے آٹھ آنے (۳)

من کی بیٹیا | صنف نازک کی ضرورتوں اور زندگی کی تلخیوں کے متعلق
محرکۃ آلا رامشور سے۔ اس دلچسپ ادبی کتاب میں حسب ذیل
عنوانوں پر بڑی مفید اور کارآمد باتیں لکھی گئی ہیں۔ گھر، سواری، ہمارے نوکر،
خور و نوش، لباس بچوں کی تعلیم اور ان کی ضرورتیں، اخبار بینی، کتابیں، نذر و نیاز
چندے، مختلف رسومات، سینما، فیشن وغیرہ، ہر تعلیم یافتہ گھر میں اس کتاب کا
ہونا ضروری ہے کتاب بہت خوب صورت اور مجلد ہے۔ مصنف محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ
ام لے صفحات (۸۰) قیمت صرف آٹھ آنے (۸ ر)

سرگزشت غالب | اردو اور فارسی کے مشہور شاعر و ادیب مرزا اسد اللہ
غالب کی حیات، کارناموں اور اعزہ و احباب کا

ایک محل تذکرہ ہے جس کو ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ام لے۔ پی ایچ ڈی
(لندن) پروفیسر ادبیات اردو جامعہ عثمانیہ نے نہایت تحقیق اور محنت سے مرتب
کیا ہے۔ طلبہ اور ادب کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے بے حد مفید ہے غالب کی تصویر
اور خاندانی شجرے بھی شائع کیے گئے ہیں یہ چھوٹی سی کتاب ساہل سال کی تحقیقات
ادب غالب کی تصنیفات اور ان کے متعلق جو کچھ ادب اب تک شائع ہوا ہے اس کا
چھوڑ ہے۔ بڑی سائز صفحات (۶۴) قیمت صرف (۸ ر)۔

